ربیع الثانی۔ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۵ھ
اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۲۳ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۴۲ شمارہ ۴

ربیع الثانی۔ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۵ھ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۲۳ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ـ ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مدیر مسئول: ڈاکٹر عارف رشید

مدیر:
ڈاکٹر ابصار احمد

نائب مدیر:
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت:
حافظ عاکف سعید۔ حافظ عاطف وحید
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ۔ مؤمن محمود
پروفیسر حافظ قاسم رضوان

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون : 500 روپے، فی شمارہ : 125 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

اسلام اور کفر: اسلام کا غلبہ؟	ڈاکٹر ابصار احمد	3

اسرار و معارف

لطائفِ تعوّذ	امام فخر الدین الرازیؒ	8

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	15

تذکّر و تدبّر

مِلاک التأویل (۳۴)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	25

فکر و نظر

ٹیکنالوجی نے ہمیں کیسے تبدیل کیا؟	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	38

تعلیم و تعلّم

مباحثِ عقیدہ (۱۵)	مؤمن محمود	57

اسلام اور سائنس

سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت	ڈاکٹر محمد رفیع الدین	72

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	ادارہ	77

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور کفر: اسلام کا غلبہ؟

ڈاکٹر ابصار احمد

اس سال یعنی ۲۰۲۳ء کے آخری سہ ماہی کے پہلے دو مہینے اکتوبر اور نومبر بعض علمی اور معاصر عالمی ملّی حوادث اور واقعات کے حوالے سے غیر معمولی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ اکتوبر کے اوائل میں فلسطین کے مسلمانوں پر اسرائیل کی طرف سے شروع کی گئی انتہائی درجے کی بربریت اور ظالمانہ وسفاک بمباری کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ غزہ کی پٹّی کی اکثر آبادیاں کھنڈر میں تبدیل کر دی گئی ہیں اور ہزاروں مرد، خواتین اور معصوم بچے شہادت کے رتبے پر فائز ہو چکے ہیں۔ حماس کے جاں بازوں نے بڑی دلیری اور حیران کن اسٹریٹجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسرائیلی افواج کی انٹیلی جنس کو ناکام بناتے ہوئے دشمن کے اوسان خطا کر دیے۔ اسرائیلی لیڈرشپ اس طرح کے اچانک حملے اور پیراشوٹ سے اترتے غازی حملہ آوروں کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ غزہ میں مساجد، تعلیم گاہوں، ہسپتالوں کے ساتھ رہائشی عمارتوں کی تباہی اور ملبے تلے دبے ہزاروں نفوس کی تصاویر دیکھ کر پوری دنیا کے مسلمان ہی نہیں، دوسرے مذاہب بشمول آرتھوڈوکس جیوز کے بڑے بڑے احتجاجی جلوس اس ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ لیکن طاقت کے نشے میں مست امریکہ، یورپین حکومتیں اور اسرائیل کی حکومت بمباری اور ظلم وستم بند کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔

اس اندوہ ناک صورت حال کی صحیح اسلامی تفہیم کے لیے دورِ نبوی ﷺ کے دوران مدینہ منورہ کے جوار میں کُفّارِ قریش سے لڑی گئی ایک جنگ ہمارے لیے ڈھارس بندھانے اور عقائدی تعلیم کا سامان رکھتی ہے۔ غزوۂ احد میں مسلمان مجاہدوں کو چرکا لگا، ستّر سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے اور خود رسول اللہ ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ کُفّار کو اپنی فتح کے شادیانے بجاتے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کُفّار کو جواب دینے کا حکم دیا، اور کہا کہ کُفّار کے نعروں کے مقابلے میں اَللّٰہ اَعْلٰی وَاَجَل (اللہ سب سے بلند اور سب سے زیادہ جلیل القدر ہے) کا نعرہ بلند کرو۔ مزید برآں بلند آواز سے کہو: ''لَاسَوَاءٌ'' (ہم برابر نہیں ہیں) اور کہو قَتْلَانَا فِی الْجَنَّۃِ وَقَتْلَاکُمْ فِی النَّارِ (ہمارے مقتول جنت میں اور تمہارے ملعون مقتولین جہنم میں ہیں)۔ انسانوں میں یہ بہت بنیادی اور جوہری فرق ہے جو ہمیں لوگوں پر واضح کرنا چاہیے۔ ہم اکثر قومی اور بین الاقوامی حوادث اور سیاسی و کلچرل اونچ نیچ پر تبصرہ اور تجزیہ کرتے ہوئے مسلمانوں اور کُفّار ومشرکین کے درمیان یہ بہت اہم بنیادی فرق

ذہن سے اوجھل کر دیتے ہیں' اور اسے قطعاً درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ تاریخ اسلامی کے آغاز ہی سے ہمارے دینی اساطین و اسلاف حق کے ساتھ تمسک اور اعتزاز بالدین کی اہمیت اُجاگر کرتے رہے ہیں۔ خلق قرآن کے مسئلہ پر جب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو 'محنۃ' (inquisition) کے دوران سخت ترین حکومتی تشدد و تعذیب کا نشانہ بنایا گیا تو کچھ مسلمانوں نے افسوس کے ساتھ امام سے کہا کہ أو لا تری الحق کیف ظھر علیه الباطل (باطل کیسے حق پر غالب آ گیا؟)۔ اس موقع پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپؒ نے فرمایا:

کلا، ان ظھور الباطل علی الحق ان تنتقل القلوب من الھدی الی الضلالة، وقلوبنا بعد لازمة للحق

''باطل کا حق پر غلبہ اور تسلّط تب ہوتا ہے جب قلوب و اذہان ہدایت سے گمراہی کی جانب منتقل ہو جائیں۔ (درآں حالیکہ) ہمارے دل اب بھی حق کے ساتھ چمٹے اور جڑے ہوئے ہیں۔''

چنانچہ اصل تشویش ناک صورتِ حال وہ ہے کہ جس میں حق انسان کے قلب میں مغلوب ہو جائے' ایمان متزلزل اور اعتزاز بالدین برائے نام رہ جائے۔ اسلام کے غلبے اور فرماں روائی کے سلسلے میں ہمارے اکابر کا ایک اہم قول بھی ملتا ہے جو ازحد ہمت افزا ہے:

دولة الباطل ساعة، دولة الحق الی قیام الساعة

''باطل کی قیادت و غلبہ تھوڑے وقت کے لیے جب کہ حق کی سربلندی اور فرماں روائی قیامت تک کے لیے ہے۔''

اسی مفہوم کو شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ترجمہ قرآن میں سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ میں ''اظہارِ دین'' کی وضاحت کرتے ہوئے فوائد میں تحریر کیا ہے کہ اسلام کا غلبہ ظاہر میں بھی ایک مدّت رہا اور یہ دلیل سے ہمیشہ غالب ہے۔ تہذیبِ جدید آزادی کے نشے میں ایسی چُور ہوئی ہے کہ اجتماعی زندگی کے دائمی آئین اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ انسان کی آزادیاں اس کی مصیبت کا سبب بن گئیں' اس لیے کہ وہ فطری حدود سے متجاوز ہو گئیں۔ انفرادیت پسندی کے ڈانڈے عمرانی اور سیاسی نقطہ نظر سے نراج (anarchy) اور عدم اقدار (nihilism) سے جا کر مل جاتے ہیں۔ چنانچہ نٹشے کا فلسفہ خودی عدل و مساوات کی اخلاقی اقدار اور مملکت و معاشرت کی ذمہ داریوں کو ڈھکوسلا بتاتا ہے۔

عصرِ حاضر میں احیائے اسلام اور دینی قوتوں کی کاوشوں کا جائزہ' assesment اور ان کی حکمت عملی کا تنقیدی ریویو محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کا خاص موضوع ہے۔ وہ مختلف فورمز اور مجلسوں میں تقریروں اور اپنے ماہنامہ ''البرہان'' میں مبسوط اور گہرے مضامین کے ذریعے اپنی فکر پیش کرتے رہتے ہیں۔ راقم ان کی ذہنی

زرخیزی‘ بلند ہمتی اور علو جذبہ وشوق کا معترف ہے اور ان کے لیے دعاؤں کے علاوہ کلمہ خیر کہتا رہا ہے۔ گزشتہ چند ماہ کے ’’البرہان‘‘ کے پرچوں میں وہ مختلف عنوانات سے اسی تھیم پر تحریرات رقم کرتے رہے ہیں اور ساتھ ہی مجلس ادارت کے کئی دوسرے فاضل مصنفین نے بھی علمی اور فکر انگیز مقالے تحریر کیے ہیں۔ خود ان کے اپنے رشحاتِ قلم اقامتِ دین‘ دین کے غلبے‘ نفاذِ شریعت اور تجدید و احیائے اسلام پر مسلسل نئے پیراؤں میں اس طرح آئے ہیں کہ یہ مصرعہ ان پر صادق آتا ہے: ع اِک پھول کا مضموں ہوں تو سو رنگ سے باندھوں۔

دینی جماعتوں میں بالخصوص انتخابی سیاست میں فعال جماعت اسلامی اور انقلابی منہج پر کاربند اور فعال تنظیم اسلامی دونوں پر ان کی تنقیدات ہیں۔ وہ پاکستان میں دینی تبدیلی کے خواہاں اور اس کے لیے جازم ہیں۔ قارئین کے لیے راقم ان کی گزشتہ چار شماروں میں شائع شدہ تحریروں کے عنوانات یہاں دے رہا ہے‘ تاکہ مختلف زاویوں اور مضامین کے تنوع کے ساتھ ان کا موقف‘ مدعا اور دینی کاوشوں کے لیے ان کی اسٹریٹجی قارئین کے سامنے آجائے۔ یاد رہے کہ بحمداللہ ’’البرہان‘‘ خاصی مقدار میں چھپتا اور ایک موقر دینی میگزین شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹر محمد امین اور ان کے معاونین کی محنت قابلِ ستائش ہے۔ پہلے ڈاکٹر امین صاحب کی تحریروں کے عنوانات دیکھ لیجیے:

(i) مغرب کی الحادی تہذیبِ بلاخیز: کیا بچاؤ کی کوئی صورت ہے؟
(ii) اسلام کے اجتماعی نظاموں کی تدوینِ نو کا صحیح طریق کار: اجتماعی اجتہاد
(iii) نفاذِ شریعت کا متبادل منہاج کیا ہے؟
(iv) ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کے تبصرے کا جواب: ’’اقامتِ دین کا صحیح منہج‘‘
(v) پاکستان میں غلبۂ دین کا متبادل لائحۂ عمل: قارئین کے تبصرے
(vi) سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں احیائے دین
(vii) عصرِ حاضر میں احیائے اسلام: پچھلی ایک صدی کی کوششوں کا جائزہ اور نئی حکمت عملی کی ضرورت

آخر الذکر موضوع پر مجلس فکر و نظر کے تحت سیمینار (کنوینر: مدیر البرہان) ۵ نومبر ۲۰۲۳ء کو فلیٹیز ہوٹل میں دو نشستوں‘ ایک صبح اور دوسری نماز و طعام کے وقفے کے بعد منعقد ہوئی۔

اب اقامتِ دین اور قیامِ ریاست مدینہ کے بارے میں چند دوسرے فاضل مصنّفین کے مقالات کے کچھ عنوانات ملاحظہ کیجیے:

(i) مسلم سرمایہ دارانہ ریاستوں میں اقامتِ دین کی تحریکوں کا لائحۂ عمل‘ از ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
(ii) تبلیغی جماعت کی جِدّ و جُہد کا نیا پہلو: پوری زندگی میں مکمل دین کا احیاء‘ از مولانا محمد سہیل
(iii) قومی ریاست میں علماء کی بے قدری (۲ اقساط)‘ از قلم سید خالد جامعی
(iv) پاکستان کی حالیہ معاشی مشکلات اور ان کا حل‘ از ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

جماعت اسلامی‘ تنظیم اسلامی‘ تحریکِ انسدادِ سود اور بعض دیگر علماء و دانشور حضرات کی گزشتہ چالیس سالوں سے عدالتوں کے ذریعے سود کے خلاف جِدّوجُہد کو بھی ڈاکٹر محمد امین صاحب من جملہ تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں (اگرچہ جو لوگ اس میں جان و مال سے ’’جہاد‘‘ کر رہے ہیں‘ انہیں مستحق تبریک و تحسین گردانتے ہیں!)۔ ڈاکٹر صاحب صحیح معنوں میں ایک متفکّر مفکّر ہیں۔ یہاں ’’البرہان‘‘ (اگست ۲۰۲۳ء) سے چند سطور کا مطالعہ قابل توجہ ہے:

’’یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان صحیح رُخ میں جِدّوجُہد ہی کے مکلف ہیں اور اس کے نتائج اللہ تعالیٰ کے بس میں ہیں‘ ہم انسانوں کے بس میں نہیں۔ پس جس نے اپنی دینی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کی وہ کامیاب و بامراد ہے خواہ اس جِدّوجُہد کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ تاہم جس چیز کے ہم مکلف ہیں وہ تدبیر اور حکمت عملی ہے جو منصوص نہیں ہوتی بلکہ ہم مسلمانوں کی اپنی بنائی ہوئی ہوتی ہے‘ اور ایک حکمت عملی کو مناسب یا مؤثر نہ پا کر اسے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور دوسری حکمت عملی اختیار کی جا سکتی ہے۔‘‘ (ص ۴۳)

راقم نے ان سطور میں جو الفاظ نمایاں کیے ہیں‘ ان کے بارے میں راقم بالکل لاعلم ہے کہ ڈاکٹر امین صاحب کے ذہن میں کیا آپشنز ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے صرف کلاسیکل منہج ہی کو بار بار دوہرایا ہے کہ پہلے تعلیم و تزکیہ سے فرد کو بدلا جائے‘ پھر یہی بدلا ہوا فرد معاشرے اور ریاست کو بھی اسلامی تقاضوں کے مطابق تبدیل کر دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ نظری منہج ہے جس پر عمل کرتے ہوئے اسلامی تحریکات ایک طویل عرصے سے لوگوں کی ذہن سازی اور کردار سازی کر رہی ہیں لیکن احتجاجی جلوسوں اور جلسوں سے آگے بات نہیں بڑھی۔ مسئلے کی واقعاتی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ آبادی کا بڑا حصہ چار چھ دہائیوں سے نہیں بلکہ ایک دو صدیوں سے منفی تعلیمی اور تہذیبی عمل کے نتیجے میں اسلام کی ’’مطلوبہ سطح‘‘ اور داخلی و وجودی تبدیلی پیدا نہیں کر سکا‘ اور نہ ہی کسی ایسی بڑی تبدیلی کا ان کی زندگی میں کوئی فی الفور امکان ہے۔ وہ اسلام سے اپنا عمومی اعتقادی تعلق قائم رکھنے کے لیے کسی ہفتہ وار درس قرآن کے ساتھ نماز روزے کا اہتمام ہی کر لیں تو بڑی بات ہے۔ ان سے غلبہ اسلام کے لیے کسی تحریک‘ مہم یا اجتماعی کوشش میں مستقل بنیاد پر ایک فعال کارکن بننے کی امید رکھنا بہت دُور کی بات ہے۔

دوسری طرف جناب حامد کمال الدین کی ایک مبسوط تحریر بعنوان ’’خطا کار مسلمانوں کو ساتھ چلانے کا چیلنج‘‘ بہت بصیرت افروز اور منہجی مواد رکھتی ہے۔ ان کے وضاحت کردہ طریق پر کام کیا جائے تو (اُن کے خیال کے مطابق) ہمارا اسلامی سیکٹر وسعت پزیر ہو کر کم از کم ایک مؤثر لابی (lobby) بن سکتا ہے جو اسلام کے لیے آواز اٹھائے۔ موثر اسلامی لابی کی اہمیت کی طرف اشارہ ۵ نومبر کے سیمینار میں مولانا زاہد الراشدی صاحب نے بھی کیا۔ اسی سیمینار میں حامد کمال الدین صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ریاست اور حکومت تو فی الحال اسلامیین کی دسترس سے باہر ہے‘ چنانچہ ہمیں اپنے معاشرے اور اس کے لیے مسجد کے ادارے پر اپنی مساعی اور توجہات کو مرکوز کرنا ہوگا۔ ایک فیس بک پوسٹ میں انہوں نے تعلیم اور اعلیٰ تدریسی اداروں میں بھی اسلام کے حق میں کسی بڑی تبدیلی کے امکان سے مایوسی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اب ہمیں اپنی دینی دعوت و جہاد کے لیے سوسائٹی اور

معاشرے کو ٹارگٹ کرنا ہوگا تاکہ اسلام کی کم از کم تمدنی اقدار کا ایک زندہ نمونہ ہمارے سامنے رہے۔ المیہ یہ ہے کہ دینی جماعتوں اور مذہبی حلقوں کے دیرینہ منسلک اور تربیت یافتہ اعضاء وارکان کی اگلی نسل بہت سے دینی شعائر کو ترک کرتی جارہی ہے۔ چنانچہ ہم سب کو اس محاذ پر بھی خصوصی محنت کرنی چاہیے۔

علامہ اقبالؒ کے اثباتِ خودی کے تصورِ خودی کی طرح ان کا بے خودی یا اجتماعیت کا تصور بھی قرآن وسنت سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے ان رجحانوں کی تشریح وتفسیر کی ہے جو اسلامی تہذیب میں ہمیشہ موجود رہے۔ کبھی دھیمے پڑ گئے اور کبھی خوب نمایاں ہوئے' لیکن رہے ہمیشہ موجود۔ اقبال کا اجتماعی فلسفہ یہ ہے کہ انسان قرآن وسُنّت کے مطابق عمل کر کے اور خودی کو مضبوط کر کے انسانیت کے اعلیٰ مقاصد یعنی دین حق اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنی جان کھپا دے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نظم وضبط کے اعتبار سے کوئی تنظیم یا جماعت کتنی ہی اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہو' ایسی جماعت کوئی تخلیقی کام انجام نہیں دے سکے گی بلکہ ایک سیٹ اور لگے بندھے ضوابط کے مطابق امور انجام دے گی۔ دوسری طرف انسانی تنظیم نظم وضبط کے ساتھ ترقی اور وژن میں بڑھوتری بھی چاہتی ہے جس کا حصول اعلیٰ ذہنی وعلمی صلاحیتوں کے لوگ ہی فراہم کر سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سوسائٹی کی ساری دینی وتہذیبی ترقی کا دارومدار انفرادی شعور اور فرد کی سعی وعمل کا رہین منت ہے۔ اکثر اوقات خود جماعتوں کی سعی وجُہد انفرادی جدت اور حوصلے پر منحصر ہوتی ہے۔ مزید برآں کسی خاص صورت حال (جو نصوصِ شریعت سے نظری استدلال کی نسبت ایک پیچیدہ تر چیز ہے) سے معاملہ کرنا خصوصی تفقہ' اپج اور اجتہادی جدت طرازی کا تقاضا کرتا ہے جو خالصتاً انفرادی صلاحیتیں ہیں اور جماعت انہیں تخلیق نہیں کر سکتی۔ برادر بزرگ ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی فہم وفراست سے نوازا تھا' اسی لیے انہوں نے احیائے اسلام اور اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے لیے پہلے مرکزی انجمن خُدام القرآن اور پھر تنظیم اسلامی کی تاسیس کی' تاکہ مذکورہ دونوں کام ایک دوسرے کی تقویت کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی کی طرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور نصرت سے آگے بڑھیں۔ السعی منا والاتمام من اللہ۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

لطائفِ تعوّذ

از: امام فخر الدین الرازیؒ ترجمہ: مکرم محمود

امام فخر الدین الرازی کی ''التفسیر الکبیر'' جس کو'' مفاتیح الغیب '' بھی کہا جاتا ہے' ایک غیر معمولی تفسیر ہے جو منقول و معقول کی جامع ہے۔'' فیہ کل شیء الا التفسیر '' (اس میں سب کچھ ہے سوائے تفسیر کے) کے قائل نے یقیناً بڑی زیادتی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔ امام صاحب کی خاص شہرت علمِ کلام اور معقولات کے حوالے سے ہے مگر ان کی شخصیت کی ایک صوفیانہ اور عارفانہ جہت بھی ہے جو اگرچہ ان کی شخصیت پر غالب نہیں ہے مگر اس کے باوجود اپنا ایک الگ مقام اور اظہار رکھتی ہے۔ اسی طرح ہمارے دوسرے بڑے علماء کا معاملہ ہے' جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہماری دینی علوم کی روایت میں تمام بڑی شخصیات کسی علم و فن میں اختصاص کے ساتھ ساتھ جامعیت کے وصف سے متصف ہیں۔ ذیل میں ترجمہ کردہ اقتباس ''مفاتیح الغیب'' کی پہلی جلد سے لیا گیا ہے جس میں تعوذ کے کچھ صوفیانہ لطائف و معارف بیان کیے گئے ہیں۔ پہلی جلد قریب قریب ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے (کل جلدیں ۱۶ ہیں) جس میں سورۃ الفاتحہ کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ ڈیڑھ دو سو صفحات تو ''اَعُوْذُ باللّٰہ '' اور ''بسم اللّٰہ '' کی تفسیر پر ہیں۔ امام صاحب نے کہیں یہ کہا تھا کہ سورۃ الفاتحہ سے دس ہزار مسائل مستنبط کیے جاسکتے ہیں۔ بعض حاسدین نے اعتراض کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ تو امام صاحب نے اپنی تفسیر میں گویا یہ دکھا دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے!) از مترجم۔

اب لطائفِ تعوذ پیشِ خدمت ہیں:

پہلا نکتہ: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ قول ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' خلق سے خالق تک اور ممکن سے واجب تک عروج کو ظاہر کرتا ہے۔ آغاز میں یہی مناسب طریقہ ہے' کیونکہ شروع میں معرفتِ حق کا سوائے اس کے کوئی ذریعہ نہیں کہ مخلوق کی محتاجی سے خالق غنی و قادر کے وجود پر دلیل پکڑی جائے۔ ''اَعُوْذُ'' میں کامل محتاجی کی طرف اشارہ ہے' کیونکہ احتیاج نہ ہو تو استعاذہ کا کوئی مطلب ہی نہیں اور ''بِاللّٰہ'' میں حق تعالیٰ کے غنائے مطلق کی طرف رہنمائی ہے۔ بندے کا ''اَعُوْذُ'' کہنا اپنے فقر و حاجت کا اقرار ہے اور ''بِاللّٰہِ'' میں دو باتوں کا اقرار ہے کہ:

۱) حق سبحانہ وتعالیٰ تمام خیرات کی تحصیل اور تمام آفات کے دفع کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

۲) حق کا غیر ان صفات سے موصوف نہیں ہوسکتا۔ حاجات کو پورا کرنے والا اُس کے سوا کوئی نہیں' اعطائے خیر و برکت کا واحد سبب بھی وہ ہے۔ اس حالت کے مشاہدے کے بعد بندہ اپنے آپ سے اور ماسوائے حق ہر

شئے سے فرار اختیار کرتا ہے۔ اس فرار میں اس پر اللہ تعالیٰ کے قول ﴿فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ ط﴾ (الذاریات :۵۰) کے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ یہ حالت گویا ''اَعُوْذُ'' کا حاصل ہے۔ پھر جب وہ غیبتِ حق سے واصل اور جلالِ حق کے نور میں غرق ہوتا ہے تو اس قول کے اسرار کا مشاہدہ کرتا ہے ﴿قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ﴾ (الانعام :۹۱) ''تم کہو اللہ' پھر انہیں چھوڑ دو!'' پھر وہ کہتا ہے: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ۔

دوسرا نکتہ: ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' عجزِ نفس اور قدرتِ رب کا اعتراف ہے اور اور یہ اس بات پر بھی دلیل ہے کہ حضرتِ الوہیت میں قرب کا وسیلہ سوائے عجز و انکسار کے اور کوئی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کلمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا'' (یہ حدیث کے طور پر ثابت نہیں' معانی درست ہیں)۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ جس نے اپنے نفس کے ضعف اور قصور کو جان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا کہ وہ ہر شئے پر قادر ہے' اور جس کو اپنے نفس کے جہل کا عرفان ہو گیا وہ اپنے رب کے فضل و عدل کا عارف ہو گیا۔ جس نے اپنے نفس کے اختلال اور تغیّرِ احوال کو دیکھ لیا وہ اپنے رب کے کمال اور جلال کا قائل ہو گیا۔

تیسرا نکتہ: طاعات کی طرف پیش قدمی شیطان سے راہِ فرار اختیار کرنے کے بعد ہی آسان ہوتی ہے۔ یہی درحقیقت اللہ تعالیٰ سے استعاذہ (پناہ طلب کرنا) ہے۔ مگر یہ استعاذہ بھی طاعات کی انواع میں سے ایک نوع ہے۔ اگر طاعات کی طرف بڑھنے سے پہلے استعاذہ ضروری ہے تو پھر اس استعاذہ کو بھی ایک استعاذہ کی حاجت ہو گی اور تسلسل لازم آئے گا۔ اور اگر طاعات کے آغاز سے پہلے استعاذہ کی حاجت ہی نہ ہو تو پھر استعاذہ کا فائدہ ہی کیا ہوا۔ گویا کہ اس سے کہا یہ جا رہا ہے کہ نیکیوں کی طرف پیش قدمی استعاذہ کے بغیر ممکن نہیں' اور یہ بات ایسی شئے کو واجب کرتی ہے جس کی کوئی نہایت ہی نہیں' اور یہ بات تمہاری وسعت سے باہر ہے۔ جب تم یہ ساری بات جان لو گے تو تم اپنے عجز و بے بسی کا مشاہدہ اور اپنے قصور کا اعتراف کر لو گے۔ بس مَیں ہی طاعات کے لیے تمہاری مدد کرتا ہوں اور تمہیں ان پر غور کرنے کا طریقہ بھی مَیں نے ہی سکھایا ہے' بس کہو: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔

چوتھا نکتہ: استعاذہ کی حقیقت قادرِ مطلق سے یہ التجا کرنا ہے کہ وہ آفات کو آپ سے دور کر دے۔ سب سے زیادہ وسوسے شیطان تلاوتِ قرآن کے دوران ڈالتا ہے' کیونکہ جو قرآن کی تلاوت رحمٰن کی عبادت کی نیت سے کرے اور اس کے وعد و وعید' آیات اور نشانیوں میں تفکّر کرے اُس کی نیکیوں میں رغبت اور برائیوں سے نفرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قراءتِ قرآن عظیم ترین طاعات میں سے ہے' لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ شیطان کی سعی بھی اس بارے میں سب سے زیادہ نہ ہو۔ پھر بندے کو بھی شیطان کے شر سے بچنے کی یہاں خاص طور پر حاجت ہے۔ اسی حکمت کے سبب سے استعاذہ کو قراءتِ قرآن کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔

پانچواں نکتہ: شیطان انسان کا دشمن ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا ط﴾ (فاطر :۶) ''بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن سمجھو۔'' رحمٰن انسان کا مولیٰ ہے۔ اُس کا خالق اور اُس کے کاموں کو درست کرنے والا ہے۔ انسان طاعات و عبادات کے آغاز میں دشمن سے شدید خوف

رکھتا ہے‘ اس لیے وہ اپنے مالک کو راضی کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اس کو دشمن کے حملوں سے بچالے۔ جب وہ واصل ہو جاتا ہے اور رونق‘ جمال اور کرم کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ دشمن کو بھول جاتا ہے اور اپنے محبوب کی خدمت ہی میں محو ہو جاتا ہے۔ بس پہلا مقام فرار کا ہے: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ دوسرا مقام بادشاہِ جبار کے حضور قرار پکڑنے کا ہے: بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔

چھٹا نکتہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝۷۹﴾ (الواقعۃ) ’’اسے پاک لوگ ہی چھوتے ہیں۔‘‘ قلبِ انسانی جب غیر اللہ سے متعلق ہوتا ہے اور زبان پر ذکرِ غیر جاری ہوتا ہے تو گویا ایک نوع کی گندگی سے آلودہ ہو جاتا ہے‘ لہٰذا لازمی ہے کہ طہارت حاصل کی جائے۔ جب وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کہتا ہے تو یہ طہارت گویا حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ حقیقی عبادت کے لیے تیار ہو جاتا ہے جو کہ اللہ کا ذکر ہے‘ پس وہ کہتا ہے: بِسْمِ اللّٰہِ ۔

ساتواں نکتہ: اربابِ اشارات کہتے ہیں کہ تمہارے دو دشمن ہیں: ایک ظاہری ہے اور ایک باطنی‘ اور ان دونوں سے جنگ ضروری ہے۔ ظاہری دشمن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (التوبۃ: ۲۹) ’’جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے ان سے جہاد کرتے رہو۔‘‘ اور باطنی دشمن کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ﴾ ’’بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن سمجھو۔‘‘ اللہ تعالیٰ گویا یہ فرما رہے ہیں کہ جب تم ظاہری دشمن سے حالتِ جنگ میں ہو گے تو مَلَک (فرشتہ) تمہاری مدد کرے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ ۝۱۲۵﴾ (آل عمران) ’’تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔‘‘ اور جب تم باطنی دشمن سے حالتِ محاربہ میں ہو گے تو تمہاری مدد مَلِک (اللہ) کرے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ﴾ (الاسراء: ۶۵) ’’بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کچھ قابو نہیں۔‘‘ اسی طرح باطنی دشمن سے لڑائی ظاہری دشمن سے لڑائی سے افضل ہے‘ کیونکہ ظاہری دشمن کی رسائی تو صرف متاعِ دنیوی تک ہے لیکن باطنی دشمن تو دین و یقین میں خلل کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح اگر ظاہری دشمن ہم پر غالب ہو بھی گیا تو ہم ماجور ہوں گے لیکن اگر باطنی دشمن ہم پر غلبہ پا گیا تو ہم تو فتنہ کا شکار ہو گئے۔ اگر ظاہری عدو نے ہمیں قتل کر دیا تو ہم شہید کہلائیں گے لیکن اگر باطنی دشمن نے ہمیں پچھاڑ دیا تو ہم مردود ہو جائیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عدوِّ باطن کے شر سے حفاظت زیادہ ضروری ہے۔ اور یہ سوائے اس کے ممکن نہیں ہے کہ انسان دل و زبان کی یکجائی کے ساتھ کہے: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔

آٹھواں نکتہ: مؤمن کا دل اشرف ترین سرزمین ہے۔ کوئی پاکیزہ سرزمین‘ کوئی سرسبز باغ‘ کوئی تروتازہ باغیچہ نہیں ہے مگر مؤمن کا دل اس سے بہتر ہے۔ مؤمن کا دل اپنی صفائی میں آئینے کی طرح ہے بلکہ اس سے بھی اعلیٰ‘ کیونکہ آئینہ کو اگر مجوب کر دیا جائے تو اس میں کچھ دکھائی نہیں دیتا لیکن قلبِ مؤمن کو سات آسمان‘ کرسی اور عرش بھی محجوب نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ

يَرْفَعُهٗ ﴾ (فاطر:۱۰) ''اُس کی طرف چڑھتے ہیں پاکیزہ کلمات اور نیک عمل ان کو بلند کرتا ہے۔''

اس بات کی کہ قلب افضل ترین جگہ ہے بہت سی وجوہات ہیں:

پہلی یہ کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے: ''قبر جنّت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔'' یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ایک نیک بندے کی میت کا وہ مکان ہے۔ جب دل خدا کی معرفت کی سیڑھی ہے' اس کی الٰہیت کے لیے بمنزلہ عرش ہے' تو لازمی بات ہے کہ وہ افضل ترین بقعہ ہو۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے! تیرا قلب میرا باغ ہے اور میری جنّت تیرا باغ ہے۔ جب تم نے اپنے باغ (قلب) کے بارے میں بخل سے کام نہیں لیا بلکہ اس کو میری معرفت کا محل بنایا تو مَیں اپنے باغ (جنّت) کے بارے میں کیوں بخل سے کام لوں اور تمہیں اس میں داخل کیوں نہ کروں؟

تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ جنّت میں بندے کے نزول کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵ ﴾ (القمر) ''قدرت والے بادشاہ کے پاس سچائی والے مقام پر''۔ صرف بادشاہ نہیں کہا۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ مَیں اُس دن بادشاہِ مقتدر ہوں گا۔ میرے بندے بھی ملوک ہی ہوں گے مگر یہ کہ وہ میری قدرت کے تابع ہوں گے۔

اگر تمہیں یہ مقدمہ سمجھ آ گیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ گویا اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ اے میرے بندے! مَیں نے اپنی جنّت تیرے لیے بنائی ہے اور تو نے اپنی جنّت (قلب) کو میرے لیے خاص کر لیا ہے' لیکن تو نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ کیا تو نے میری جنّت دیکھی ہے اور کیا تو اس میں داخل ہوا ہے؟ تو بندہ کہے گا: نہیں اے میرے رب۔ پھر اللہ تعالیٰ کہے گا کہ کیا میں تیری جنّت میں داخل ہوا ہوں؟ لازمی بات ہے کہ وہ بندہ کہے گا کہ ہاں میرے رب۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تُو ابھی تک میری جنّت میں داخل نہیں ہوا لیکن جب تمہارا داخلہ قریب ہوا تو مَیں نے اپنی جنّت سے شیطان کو تیرے آنے کی وجہ سے نکال باہر کیا اور کہا کہ اس میں سے نکل ذلیل و مردود ہو کر۔ تو مَیں نے تیرے دشمن کو تیرے آنے سے پہلے نکال دیا ہے' جبکہ تمہارا معاملہ یہ ہے کہ تیرے قلب میں میرے نزول کے ستّر برس بعد بھی تیرے لیے کیسے ممکن ہے کہ تو میرے دشمن کو باہر نہ نکال دے اور اس کو دھتکار نہ دے! بندہ اس کے بعد جواب دے گا اور کہے گا کہ اے میرے معبود! تُو تو اپنی جنّت سے اس کے اخراج پر قادر تھا۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے تو مَیں تو عاجز ہوں ضعیف ہوں اور اس کے خروج پر قادر نہیں ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ عاجز کو جب ایک قاہر بادشاہ کی حمایت حاصل ہو جائے تو وہ بھی قوی ہو جاتا ہے' تو پس تم میری حمایت میں داخل ہو جاؤ' یہاں تک کہ تم اپنے قلب کی جنّت سے اپنے دشمن کے اخراج پر قادر ہو جاؤ۔ بس یہ کہو: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب قلب مؤمن اللہ کا باغ ہے تو وہ خود کیوں نہیں شیطان کو دیس نکالا دے ڈالتا؟

ہم جواب میں کہیں گے کہ اہلِ اشارات فرماتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ بندے سے کہہ رہے ہیں کہ سلطانِ

معرفت کو تو تم نے خود اپنے حجرۂ قلب میں داخل کیا ہے۔ جو کوئی سلطان کو اپنے حجرہ میں لانا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ اس مکان کی صفائی کرے اور اس کی نظافت کا بندوبست کرے۔ سلطان پر تو یہ اعمال لازم نہیں۔ پس وسوسے کی ناپاکی سے اپنے قلب کے حجرہ کی تنظیف کرو اور کہو: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم۔

نواں نکتہ: گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اے میرے بندے! تُو نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ کیا تجھے پتہ ہے کہ کیا چیز میرے اور شیطان کے درمیان کدورت کا باعث بنی؟ وہ تو میری فرشتوں کی مانند عبادت کیا کرتا تھا اور ظاہری طور پر میری الوہیت کا اقرار کرنے والا تھا' لیکن کدورت کی وجہ یہ بنی کہ مَیں نے اُسے تیرے باپ آدم کو سجدہ کرنے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ جب اُس نے تکبر کیا تو میں نے اس کو اپنی خدمت سے روک دیا۔ اس نے درحقیقت تیرے باپ سے عداوت نہیں دکھائی تھی بلکہ اُس نے میری خدمت سے انکار کیا۔ پھر وہ تجھ سے ستر سال سے عداوت رکھتا ہے اور تو اس سے محبت کرتا ہے! وہ ہر نیکی کے کام میں تیری مخالفت کرتا ہے اور تُو تمام مرادات میں اس کی موافقت کرتا ہے؟ اس مذموم طریقہ کو چھوڑ اور اس سے اپنی عداوت کا اظہار کر اور کہہ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم۔

دسواں نکتہ: اگر تو اپنے باپ آدم کے قصہ پر غور کرے گا تو جان لے گا کہ شیطان نے تیرے باپ سے قسمیں کھا کر کہا تھا کہ وہ اُس کے خیر خواہوں میں سے ہے۔ اور اس معاملے کا انجام یہ ہوا کہ اُس نے تیرے باپ کے جنّت سے اخراج کے لیے پوری کوشش کی۔ تیرے حق میں تو اُس نے قسم ہی تجھے اغوا کرنے اور گمراہ کرنے کی کھائی ہے۔ وہ کہتا ہے: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾﴾ (ص) ''پس تیری عزت کی قسم' مَیں ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔'' جس کے ساتھ اُس نے خیر خواہی کی قسم کھائی اُس کے ساتھ اس نے یہ معاملہ کیا' تو غور کر کہ اس کے ساتھ کیا کرے گا جس کے بارے میں اُس نے قسم ہی اغوا اور گمراہ کرنے کی کھائی ہے!

گیارہواں نکتہ: صرف اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کہا ہے' کسی اور اسم کا ذکر نہیں ہے۔ صرف 'اللہ' کا ذکر ہے کیوں کہ یہ اسم تمام اسماء وصفات میں معاصی سے روکنے میں زیادہ بلیغ ہے' کیونکہ الاله ہی مستحقِ عبادت ہے' اور یہ تبھی ہوگا جب وہ قادر' علیم اور حکیم ہو۔ گویا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کا مطلب ہے اَعُوْذُ بِالْقَادِرِ الْعَلِیْمِ الْحَکِیْم۔ یہ صفات زجر (ڈانٹ) میں اپنی منتہا پر ہیں۔ جیسے چور سلطان کی قدرت سے واقف ہوتا ہے پھر بھی مال چراتا ہے' کیونکہ چور جانتا ہے کہ اگرچہ سلطان قادر ہے مگر اس کو اس چوری کا علم نہیں ہے۔ خالی قدرت زجر کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ علم بھی ضروری ہے۔ اسی طرح علم اور قدرت بھی زجر کے لیے کفایت نہیں کرتے' کیونکہ بادشاہ منکر کو دیکھے مگر اس سے منع نہ کرے تو صرف بادشاہ کا موجود ہونا ہی اس منکر سے روکنے کے لیے کافی نہ ہوگا مگر یہ کہ بادشاہ کو قدرت اور علم کے ساتھ ساتھ حکمت بھی حاصل ہو جو کہ قبیح افعال سے روکے۔ اب کامل زجر حاصل ہوگا۔ جب بندہ کہتا ہے: ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں قادر' علیم اور حکیم کی پناہ میں آتا ہوں جو کہ منکرات سے راضی نہیں ہوتا۔ کوئی شک نہیں کہ اب مکمل اور تام زجر حاصل ہو جائے گا۔

بارہواں نکتہ: بندہ جب اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کہتا ہے تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ شیطان کا ساتھ نہیں چاہتا' اس وجہ سے کہ شیطان گناہ گار ہے' حالانکہ اس کا گناہ حقیقت میں انسان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جب بندہ گناہ گار کا ساتھ نہیں چاہتا تو گناہ کا ساتھ تو وہ لازماً نہ چاہے گا۔

تیرہواں نکتہ: شیطان اسم ہے اور رجیم (مردود) اس کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اس کا نام ذکر نہیں کیا بلکہ ساتھ صفت بھی بیان کی ہے۔ گویا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس شیطان نے ہزاروں سال خدمت کی ہے' پھر تم نے کچھ بھی سنا کہ اُس نے ہمیں کوئی ضرر پہنچایا ہو یا ہمارے ساتھ کچھ برا کیا ہو؟ اس کے باوجود (نافرمانی کی وجہ سے) ہم نے اسے مردود قرار دیا اور نکال باہر کیا۔ باقی جہاں تک تمہارا معاملہ ہے تو تمہارے ساتھ شیطان کی مختصر مجالست تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈالنے کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اسے دھتکارنے اور اس پر لعنت کرنے میں مصروف نہ ہو؟ بس کہو: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔

چودہواں نکتہ: کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اَعُوْذُ بِالْمَلَائِکَۃِ کیوں نہیں کہا گیا جب کہ ایک اسفل فرشتہ بھی شیطان کو بھگانے کے لیے کافی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اس کلب (شیطان) کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ کیا گیا؟ اس کے جواب میں گویا اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے وہ تمہیں دیکھ رہا ہے تم اس کو نہیں دیکھ رہے ﴿اِنَّہٗ یَرٰىکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ ۭ﴾ (الاعراف:۲۷) ''وہ اور اُس کا قبیلہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے''۔ شیطان کے مکر و فریب کا تم لوگ شکار ہی اس لیے ہوتے ہو کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھتے۔ بس تم اُس کے ساتھ تعلق کو لازم پکڑ لو جو شیطان کو دیکھتا ہے مگر شیطان اُسے نہیں دیکھ پاتا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ پس کہو: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔

پندرہواں نکتہ: شیطان پر 'ال' جنس کی تعریف کے لیے داخل کیا گیا ہے' کیونکہ شیاطین بہت سے ہیں' کچھ مرئی ہیں کچھ غیر مرئی۔ بلکہ مرئی بعض اوقات زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ بعض اہلِ ذکر سے مروی ہے کہ ان میں سے کسی نے اپنی مجلس میں کہا کہ جب بندہ صدقہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ستر شیطان اس کے پاس آ کر اس کے ہاتھ' پاؤں اور قلب سے چمٹ جاتے ہیں تاکہ اس کو صدقہ سے روک سکیں۔ اہلِ ذکر ہی میں سے کسی نے یہ بات سنی تو کہا کہ مَیں ان ستر شیاطین سے قتال کروں گا۔ پھر وہ مسجد سے نکل کر گھر آیا اور نیچے بہت سی گندم موجود تھی۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اس کو نکالا جائے اور صدقہ کیا جائے تو اُس کی بیوی نے اچھل کود شروع کر دی' اس سے لڑنا شروع کر دیا اور تنازعہ کھڑا کر دیا۔ اس پر وہ بندہ ناکام و نامراد مسجد کو لوٹا تو مذکِّر نے کہا کہ کیا کیا تم نے؟ اس بندے نے جواب دیا کہ مَیں نے ستّر شیاطین کو شکست دی مگر اُن کی ماں آ گئی اور اس نے مجھے شکست دے ڈالی۔

اگر ہم اس الف لام کو عہدِ ذہنی کا بھی مان لیں تو تب بھی کوئی مسئلہ نہیں' کیوں کہ تمام معاصی شیطان کی مرضی سے ہوتے ہیں اور راضی ہونے والا گویا فاعل ہی ہے۔ اگر تمہیں سمجھ نہ آ رہی ہو تو اس کو ایک شرعی مسئلہ کے ذریعے سمجھ لو۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے' اس اعتبار سے کہ وہ اس پر راضی ہے اور

پیچھے خاموش کھڑا ہے۔

سولہواں نکتہ: الشَّیْطَان 'شطن' (دور کرنا' باندھنا) سے ماخوذ ہے جب وہ دور ہوا۔ اس پر یہ حکم اس اعتبار سے ہے کہ وہ (اللہ کی رحمت سے) دور ہے۔ مطیع اللہ سے قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿١٩﴾﴾ (العلق) ''سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ''۔ اللہ تم سے قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ﴾ (البقرۃ: ۱۸۶) ''جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو بتا دیجیے کہ میں قریب ہوں۔'' رجیم کو تو رجیم کہا گیا ہے ان معنوں میں کہ لعنت اور شقاوت کے تیر اسے مارے گئے ہیں۔ جہاں تک تمہارا معاملہ ہے تو تم سعادت کی رسی کے ذریعے منزلِ مراد کو پہنچے ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ﴾ (الفتح: ۲۶)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو بعید اور مرجوم (رجم کیا ہوا) کیا ہے اور تمہیں واصل بنایا ہے اور اپنا قرب عطا کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ شیطان کو جو بعید ہے' قریب نہیں کرے گا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ﴿٤٣﴾﴾ (فاطر) ''اور تم اللہ تعالیٰ کی سُنّت کو بدلتے ہوئے نہیں پاؤ گے۔'' پس جان لو کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمہیں اپنا قرب عطا کیا ہے تو وہ اپنے فضل اور رحمت سے تمہیں دھتکارے گا نہیں اور نہ تمہیں اپنے سے دور کرے گا۔

سترہواں نکتہ: جعفر الصادقؒ کہتے ہیں: قراءت سے پہلے تعوذ لازمی ہے جبکہ باقی طاعات سے پہلے تعوذ کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ انسان کی زبان جھوٹ' چغلی اور غیبت سے ناپاک ہو جاتی ہے' تو اللہ تعالیٰ نے تعوذ کا حکم اس لیے دیا ہے تاکہ بندے کی زبان پاک ہو جائے اور وہ پاک زبان سے ربِ طیب وطاہر کے نازل کردہ پاک کلام کی تلاوت کرے۔

اٹھارہواں نکتہ: گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ وہ شیطانِ رجیم ہے اور میں رحمٰن ورحیم ہوں۔ پس شیطانِ رجیم سے دور ہو جاؤ تاکہ رحمٰن ورحیم سے واصل ہو سکو۔

انیسواں نکتہ: شیطان تمہارا دشمن ہے اور تم اس سے غافل بھی ہو' غائب بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ﴾۔ پس تمہارا ایک غائب دشمن ہے اور ایک غالب دوست ہے۔ قولِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ﴾ (یوسف: ۲۱) ''اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے۔'' جب غائب دشمن تمہارا قصد کرے تو تم غالب حبیب کی طرف فرار اختیار کرو۔ باقی أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کی مراد سے اللہ عزّوجل ہی واقف ہے۔

❁❁❁

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سُورۃُ الرَّعد

آیات ۱۸ تا ۲۴

﴿ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۭ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۸ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۱۹ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝۲۰ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْۗءَ الْحِسَابِ ۝۲۱ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝۲۲ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝۲۳ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ ۭ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝۲۴ ﴾

ترکیب

(آیت ۱۹) اَنَّمَا اُنْزِلَ میں اَنَّمَا کلمۂ حصر نہیں ہے بلکہ یہ اَنَّ مَا ہے۔ یہ قرآن مجید کا مخصوص املا ہے کہ یہاں اس کو ملا کر لکھا گیا ہے۔ جبکہ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ میں اِنَّمَا کلمۂ حصر ہے۔ (آیت ۲۲) اِبْتِغَاءَ مفعول لَہٗ ہے اور اس کو حال ماننے کی بھی گنجائش ہے۔ ہم ترجمہ مفعول لَہٗ کے لحاظ سے کریں گے۔ جبکہ سِرًّا اور عَلَانِیَۃً حال ہیں۔

ترجمہ:

لِلَّذِیْنَ: ان کے لیے جنہوں نے — اسْتَجَابُوْا: حکم مانا

لِرَبِّهِمُ :اپنے رب کا
وَالَّذِيْنَ :اور جنہوں نے
لَهٗ :اُس کا
لَهُمْ :ان کے لیے (ہوتا)
جَمِيْعًا :سب کا سب
مَعَهٗ :اس کے ساتھ (اور ہوتا)
بِهٖ :اسے دے کر
لَهُمْ :جن کے لیے ہے
وَمَاْوٰىهُمْ :اوران کے اترنے کی جگہ
وَبِئْسَ :اور (وہ) کتنی بری
اَفَمَنْ :تو کیا جو
اَنَّمَآ اُنْزِلَ :کہ وہ جو اتارا گیا
مِنْ رَّبِّكَ :آپؐ کے رب (کی طرف) سے
كَمَنْ :اُس کی مانند ہے
اِنَّمَا :کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
اُولُوا الْاَلْبَابِ :اوہام سے پاک عقل والے
بِعَهْدِ اللّٰهِ :اللہ کے عہد کو
الْمِيْثَاقَ :اُس وعدہ کو
يَصِلُوْنَ :ملاتے ہیں
بِهٖٓ اَنْ :جس کا کہ
وَيَخْشَوْنَ :اور ڈرتے رہتے ہیں
وَيَخَافُوْنَ :اور اندیشہ رکھتے ہیں
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا :اور جو لوگ ثابت قدم رہے

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ :اور انہوں نے قائم کی نماز
مِمَّا :اس میں سے جو
سِرًّا :چھپاتے ہوئے

الْحُسْنٰى :کل بھلائی ہے
لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا :حکم نہیں مانا
لَوْ اَنَّ :اگر یہ کہ
مَّا فِي الْاَرْضِ :وہ جو زمین میں ہے
وَّمِثْلَهٗ :اور اس کے جیسا
لَافْتَدَوْا :تو ضرور خود کو چھڑاتے
اُولٰٓئِكَ :وہ لوگ ہیں
سُوْٓءُ الْحِسَابِ :برا حساب
جَهَنَّمُ :جہنم ہے
الْمِهَادُ :آرام گاہ ہے
يَّعْلَمُ :جانتا ہے
اِلَيْكَ :آپؐ کی طرف
الْحَقُّ :کل حق ہے
هُوَ اَعْمٰى :(کہ) وہ اندھا ہے
يَتَذَكَّرُ :نصیحت حاصل کرتے ہیں
الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ :جو لوگ پورا کرتے ہیں
وَلَا يَنْقُضُوْنَ :اور وہ نہیں توڑتے
وَالَّذِيْنَ :اور جو لوگ
مَآ اَمَرَ اللّٰهُ :اس کو حکم دیا اللہ نے
يُوْصَلَ :وہ ملایا جائے
رَبَّهُمْ :اپنے ربّ سے
سُوْٓءَ الْحِسَابِ :برے حساب کا
ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ :اپنے رب کی توجہ کی جستجو میں
وَاَنْفَقُوْا :اور انہوں نے خرچ کیا
رَزَقْنٰهُمْ :ہم نے عطا کیا ان کو
وَّعَلَانِيَةً :اور اعلانیہ

وَيَدْرَءُوْنَ : اور ہٹاتے ہیں	بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ : بھلائی سے برائی کو
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ : وہ لوگ ہیں جن کے لیے ہے	عُقْبَى الدَّارِ : اس (آخری) گھر کا انجام
جَنّٰتُ عَدْنٍ : عدن کے باغات ہیں	يَّدْخُلُوْنَهَا : وہ لوگ داخل ہوں گے ان میں
وَمَنْ صَلَحَ : اور وہ (بھی) جو نیک ہوا	مِنْ اٰبَآئِهِمْ : ان کے آباء واجداد میں سے
وَاَزْوَاجِهِمْ : اور ان کے جوڑوں میں سے	وَذُرِّيّٰتِهِمْ : اور ان کی اولادوں میں سے
وَالْمَلٰٓئِكَةُ : اور فرشتے	يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ : داخل ہوں گے ان پر
مِّنْ كُلِّ بَابٍ : ہر دروازے سے	سَلٰمٌ : (وہ کہیں گے) سلامتی ہو
عَلَيْكُمْ : تم لوگوں پر	بِمَا : بسبب اس کے جو
صَبَرْتُمْ : تم لوگ ثابت قدم رہے	فَنِعْمَ : تو کتنا اچھا ہے
عُقْبَى الدَّارِ : اس (آخری) گھر کا انجام	

نوٹ: ان آیات میں اللہ کا حکم ماننے والوں کی کچھ صفات کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ لوگ برائی کے جواب میں برائی نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ بھی بھلائی کرتے ہیں جو ان کے ساتھ برائی کرے۔ اس مفہوم کی وضاحت میں ہمیں متعدد احادیث ملتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''تم اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع بنا کر مت رکھو''۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی کریں گے اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ تم اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ۔ اگر لوگ نیکی کریں تو تم نیکی کرو؛ اور اگر لوگ تم سے بدسلوکی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔ اسی معنی میں وہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے''۔ اور ان میں سے چار باتیں آپ ﷺ نے یہ فرمائیں کہ ''مَیں خواہ کسی سے خوش ہوں یا ناراض؛ ہر حالت میں انصاف کی بات کہوں؛ جو میرا حق مارے مَیں اُس کا حق ادا کروں؛ جو مجھے محروم کرے مَیں اُس کو عطا کروں اور جو مجھ پر ظلم کرے مَیں اُس کو معاف کردوں''۔ اور اسی معنی میں وہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو تجھ سے خیانت کرے تو اُس سے خیانت نہ کر''۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۲۵ تا ۲۹

﴿وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾﴾

ترجمہ:

وَالَّذِيْنَ :اور وہ لوگ جو

يَنْقُضُوْنَ :توڑتے ہیں

عَهْدَ اللهِ :اللہ کے عہد کو

مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ :اس کے پختہ ہونے کے بعد

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ :اور وہ لوگ کاٹتے ہیں اس کو

اَمَرَ اللهُ :حکم دیا اللہ نے

بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ :جس کا کہ وہ جوڑا جائے

وَيُفْسِدُوْنَ :اور وہ لوگ نظم بگاڑتے ہیں

فِي الْاَرْضِ :زمین میں

اُولٰٓئِكَ لَهُمُ :وہ لوگ ہیں جن کے لیے ہے

اللَّعْنَةُ :کل لعنت

وَلَهُمْ :اور ان کے لیے ہے

سُوْٓءُ الدَّارِ :اس (آخری) گھر کی برائی

اَللهُ يَبْسُطُ :اللہ کشادہ کرتا ہے

الرِّزْقَ :رزق کو

لِمَنْ :اس کے لیے جس کو

يَّشَآءُ :وہ چاہتا ہے

وَيَقْدِرُ :اور وہ اندازہ لگاتا ہے (یعنی ناپ تول کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے)

وَفَرِحُوْا :اور وہ لوگ خوش ہوئے

بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا :دنیوی زندگی پر

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا :اور دنیوی زندگی نہیں ہے

فِي الْاٰخِرَةِ :آخرت (کے مقابلہ) میں

اِلَّا مَتَاعٌ :مگر ایک برتنے کا سامان

وَيَقُوْلُ :اور کہتے ہیں

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا :وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا

لَوْلَآ اُنْزِلَ :کیوں نہیں اتاری جاتی

عَلَيْهِ اٰيَةٌ :انؐ پر کوئی نشانی

مِّنْ رَّبِّهٖ :ان کے رب (کی طرف) سے

قُلْ :آپؐ کہیے

اِنَّ اللهَ :بے شک اللہ

يُضِلُّ :گمراہ کرتا ہے

مَنْ يَّشَآءُ :اُس کو جس کو وہ چاہتا ہے

وَيَهْدِيْٓ :اور وہ ہدایت دیتا ہے

اِلَيْهِ :اپنی طرف

مَنْ :اس کو جس نے

اَنَابَ :رُخ کیا (اس کی طرف)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا :جو لوگ ایمان لائے

وَتَطْمَئِنُّ :اور اطمینان پاتے ہیں

قُلُوْبُهُمْ :ان کے دل

بِذِكْرِ اللهِ :اللہ کی یاد سے

اَلَا :سن لو

بِذِكْرِ اللهِ :اللہ کی یاد سے ہی

تَطْمَئِنُّ :اطمینان پاتے ہیں

الْقُلُوْبُ :دل

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا :جو لوگ ایمان لائے

وَعَمِلُوا :اور انہوں نے عمل کیے

الصّٰلِحٰتِ :نیکیوں کے

طُوْبٰى :تو انتہائی فرحت ہے

لَهُمْ :ان کے لیے

وَحُسْنُ مَاٰبٍ :اور لوٹنے کی جگہ کا حسن ہے

آیات ۳۰ تا ۳۲

﴿كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ۝۳۰ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۭ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۭ اَفَلَمْ يَايْــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۳۱ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۡ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝۳۲﴾

قرع

قَرَعَ يَقْرَعُ (ف) قَرْعًا: کھٹکھٹانا۔

قَارِعَةٌ: کھٹکھٹانے والی' آفت۔ زیر مطالعہ آیت ۳۱

ترکیب

(آیت ۳۰) مَتَابِ کی کسرہ بتا رہی ہے کہ اس کے آگے یائے متکلم محذوف ہے' یعنی یہ مَتَابِیْ ہے۔ (آیت ۳۱) پروفیسر حافظ احمد یار صاحبؒ کا کہنا ہے کہ یَئِسَ کے بعد مِنْ کا صلہ آئے تو معنی ہوتے ہیں: ''مایوس ہونا'' اگر اَنْ کا صلہ آئے تو معنی ہوتے ہیں: ''جاننا''۔ اس کی سند ''المنجد'' کے علاوہ کچھ تفاسیر ہیں جن میں اس کی سند کے لیے اشعارِ جاہلیہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اور قرآن مجید میں یہ واحد مقام ہے جہاں یَئِسَ اَنْ کے صلہ کے ساتھ ''جاننا'' کے معنی میں آیا ہے۔ ترجمہ میں ہم حافظ صاحب کی رائے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت ۳۲) عِقَابِ بھی دراصل عِقَابِیْ ہے۔

ترجمہ:

كَذٰلِكَ: اس طرح	اَرْسَلْنٰكَ: ہم نے بھیجا آپؐ کو
فِيْٓ اُمَّةٍ: ایک ایسی اُمت میں	قَدْ خَلَتْ: گزر چکی ہیں
مِنْ قَبْلِهَآ: جس سے پہلے	اُمَمٌ: کچھ اُمتیں
لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ: تاکہ آپؐ پڑھ کر سنائیں ان کو	الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ: وہ جو ہم نے وحی کیا
اِلَيْكَ: آپؐ کی طرف	وَهُمْ: حالانکہ وہ لوگ
يَكْفُرُوْنَ: انکار کرتے ہیں	بِالرَّحْمٰنِ: رحمٰن کا

قُلْ: آپؐ کہیے

لَآ اِلٰهَ: کوئی الٰہ نہیں ہے

عَلَيْهِ: اس پر ہی

وَ اِلَيْهِ: اور اُس کی طرف ہی

وَلَوْ اَنَّ: اور اگر یہ کہ

سُيِّرَتْ: چلائے جاتے

اَوْ قُطِّعَتْ: یا ٹکڑے ٹکڑے کی جاتی

اَوْ كُلِّمَ: یا بلوائے جاتے

بَلْ لِّلّٰهِ: بلکہ اللہ کے لیے ہی ہیں

جَمِيْعًا: سب کے سب

الَّذِيْنَ: ان لوگوں نے جو

اَنْ لَّوْ: کہ اگر

لَهَدَى: تو ضرور ہدایت دیتا

جَمِيْعًا: سب کے سب کو

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: جنہوں نے کفر کیا

بِمَا: بسبب اس کے جو

قَارِعَةٌ: کوئی آفت

قَرِيْبًا: نزدیک ہی

حَتّٰى يَاْتِيَ: یہاں تک کہ آئے

اِنَّ اللّٰهَ: بے شک اللہ

الْمِيْعَادَ: وعدے کے

بِرُسُلٍ: رسولوں کا

فَاَمْلَيْتُ: تو مَیں نے مہلت دی

كَفَرُوْا: کفر کیا

فَكَيْفَ كَانَ: تو کیسا تھا

هُوَ رَبِّيْ: وہ میرا رب ہے

اِلَّا هُوَ: مگر وہ (ہی)

تَوَكَّلْتُ: مَیں نے بھروسہ کیا

مَتَابِ: میرا لوٹنا ہے

قُرْاٰنًا: کوئی ایسا قرآن (ہوتا)

بِهِ الْجِبَالُ: جس سے پہاڑ

بِهِ الْاَرْضُ: جس سے زمین

بِهِ الْمَوْتٰى: جس سے مردے

الْاَمْرُ: تمام معاملات

اَفَلَمْ يَايْئَسِ: تو کیا جانا ہی نہیں

اٰمَنُوْا: ایمان لائے

يَشَآءُ اللّٰهُ: چاہتا اللہ

النَّاسَ: لوگوں کو

وَلَا يَزَالُ: اور ہمیشہ

تُصِيْبُهُمْ: آلگتی رہے گی ان کو

صَنَعُوْا: انہوں نے کارستانی کی

اَوْ تَحُلُّ: یا (ہمیشہ) اترتی رہے گی

مِّنْ دَارِهِمْ: ان کے گھر سے

وَعْدُ اللّٰهِ: اللہ کا وعدہ

لَا يُخْلِفُ: خلاف نہیں کرتا

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ: اور بے شک مذاق اڑایا جاچکا ہے

مِّنْ قَبْلِكَ: آپؐ سے پہلے

لِلَّذِيْنَ: ان کو جنہوں نے

ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ: پھر مَیں نے پکڑا ان کو

عِقَابِ: میرا پکڑنا

آیات ۳۳ تا ۳۷

﴿ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۳۳ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝۳۴ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۠ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝۳۵ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝۳۶ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝۳۷ ﴾

دوم

دَامَ يَدُوْمُ (ن) دَوَامًا : ساکن رہنا، ہمیشہ رہنا۔

مَادَامَ (افعالِ ناقصہ) : دیکھیں آیت البقرۃ: ۵۷، نوٹ ۱

دَائِمٌ : ساکن رہنے والا، ہمیشہ رہنے والا۔ زیرِ مطالعہ آیت ۳۵۔

ترجمہ:

اَفَمَنْ هُوَ : تو کیا وہ جو	قَآئِمٌ : نگرانی کرنے والا ہے
عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ : ہر ایک جان کی	بِمَا : اس کے ساتھ جو
كَسَبَتْ : اس نے کمایا (کسی کے مانند ہو سکتا ہے)	وَجَعَلُوْا : اور (پھر بھی) انہوں نے بنائے
لِلّٰهِ : اللہ کے لیے	شُرَكَآءَ : کچھ شریک
قُلْ : آپؐ کہیے	سَمُّوْهُمْ : تم لوگ نام (یعنی صفات) بتاؤ ان کی
اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ : یا تم لوگ خبر دیتے ہو اُس کو	بِمَا : اس کی جو
لَا يَعْلَمُ : وہ نہیں جانتا (یعنی جس کا وجود نہیں ہے)	فِي الْاَرْضِ : زمین میں
اَمْ بِظَاهِرٍ : یا (فریفتہ ہو) ظاہری پر	مِّنَ الْقَوْلِ : بات سے
بَلْ زُيِّنَ : بلکہ سجایا گیا	لِلَّذِيْنَ : ان کے لیے جنہوں نے
كَفَرُوْا : کفر کیا	مَكْرُهُمْ : ان کی چالبازی کو

وَصُدُّوْا : اور وہ لوگ روک دیے گئے
وَمَنْ : اور جس کو
فَمَا لَهٗ : تو نہیں ہے اُس کے لیے
لَهُمْ عَذَابٌ : ان کے لیے ایک عذاب ہے
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ : اور یقیناً آخرت کا عذاب
وَمَا لَهُمْ : اور نہیں ہے ان کے لیے
مِنْ وَّاقٍ : کوئی بھی بچانے والا
وُعِدَ : وعدہ کیا گیا
تَجْرِیْ : بہتی ہیں
الْاَنْهٰرُ : نہریں
دَآئِمٌ : ہمیشہ ہے
تِلْكَ : یہ ہے
اتَّقَوْا : تقویٰ اختیار کیا
النَّارُ : آگ ہے
اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ : ہم نے دی جن کو کتاب
بِمَآ اُنْزِلَ : اس سے جو اتارا گیا
وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ : اور گروہوں میں سے وہ بھی ہیں جو
بَعْضَهٗ : اس کے بعض کا
اُمِرْتُ : مجھے حکم دیا گیا
وَلَآ اُشْرِكَ : اور میں شریک نہ کروں (کسی کو)
اِلَیْهِ : اُس کی طرف ہی
وَاِلَیْهِ : اور اُس کی طرف ہی
وَكَذٰلِكَ : اور اس طرح
حُكْمًا : حکم ہوتے ہوئے
وَلَئِنِ : اور یقیناً اگر
اَهْوَآءَهُمْ : اُن کی خواہشات کی
عَنِ السَّبِیْلِ : اس راستے سے
یُّضْلِلِ اللّٰهُ : گمراہ کرتا ہے اللہ
مِنْ هَادٍ : کوئی بھی ہدایت دینے والا
فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا : دنیوی زندگی میں
اَشَقُّ : سب سے زیادہ دشوار ہے
مِّنَ اللّٰهِ : اللہ سے
مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ : اُس جنت کی مثال جس کا
الْمُتَّقُوْنَ : متقی لوگوں سے (یہ ہے کہ)
مِنْ تَحْتِهَا : اس کے نیچے سے
اُكُلُهَا : اس کا پھل
وَّظِلُّهَا : اور اُس کا سایہ (بھی)
عُقْبَى الَّذِیْنَ : انجام اُن لوگوں کا جنہوں نے
وَّعُقْبَى الْكٰفِرِیْنَ : اور کافروں کا انجام
وَالَّذِیْنَ : اور وہ لوگ
یَفْرَحُوْنَ : خوش ہوتے ہیں
اِلَیْكَ : آپؐ کی طرف
یُنْكِرُ : انکار کرتے ہیں

قُلْ اِنَّمَآ : آپؐ کہیے کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ : کہ میں بندگی کروں اللہ کی
بِهٖ : اُس کے ساتھ
اَدْعُوْا : میں بلاتا ہوں
مَاٰبِ : میرے لوٹنے کی جگہ ہے
اَنْزَلْنٰهُ : ہم نے اُتارا اس کو
عَرَبِیًّا : عربی زبان میں
اتَّبَعْتَ : آپؐ نے پیروی کی
بَعْدَ مَا : اس کے بعد کہ جو

جَآءَكَ : آیا آپؐ کے پاس
مِنَ الْعِلْمِ : علم میں سے
مَا لَكَ : تو نہیں ہوگا آپؐ کے لیے
مِنَ اللّٰهِ : اللہ سے
مِنْ وَّلِيٍّ : کوئی بھی حمایت کرنے والا
وَّلَا وَاقٍ : اور نہ کوئی بھی بچانے والا

نوٹ ۱ : آیت ۳۳ کے ترجمہ میں ہم نے ''نام'' کے ساتھ ''صفات'' کا اضافہ کیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے آیت البقرۃ:۲۱ کا نوٹ ادوبارہ دیکھ لیں۔

نوٹ ۲ : آیت ۳۳ میں شرک کو مکاری یعنی چالبازی اس لیے کہا گیا ہے کہ جن اجرامِ فلکی یا فرشتوں یا ارواح یا بزرگ انسانوں کو خدائی اختیارات میں شریک قرار دیا گیا ہے ان میں سے کسی نے بھی کبھی ان اختیارات وصفات کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ تو چالاک انسانوں کا کام ہے کہ انہوں نے عوام پر اپنی خدائی کا سکّہ جمانے کے لیے اور ان کی کمائی میں حصّہ بٹانے کے لیے کچھ بناوٹی خدا تصنیف کیے' لوگوں کو اُن کا معتقد بنایا اور اپنے آپ کو ان کا نمائندہ ٹھہرا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۳۸ تا ۴۳

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ وَيُثْبِتُ ښ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾ ﴾

م ح و

مَحَا يَمْحُوْا (ن) مَحْوًا : کسی چیز اور نشان کو مٹا دینا۔ زیرِ مطالعہ آیت ۳۹۔

ترجمہ:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا : اور ہم بھیج چکے ہیں
رُسُلًا : کچھ رسولوں کو
مِّنْ قَبْلِكَ : آپؐ سے پہلے
وَجَعَلْنَا : اور ہم نے بنائیں
لَهُمْ اَزْوَاجًا : ان کے لیے بیویاں
وَّذُرِّيَّةً : اور اولاد
وَمَا كَانَ : اور (ممکن) نہیں تھا
لِرَسُوْلٍ : کسی رسول کے لیے
اَنْ يَّاْتِيَ : کہ وہ لائے
بِاٰيَةٍ : کوئی نشانی

إِلَّا : مگر
لِكُلِّ أَجَلٍ : ہر ایک کا وقت (خاتمہ کا)
يَمْحُوا اللّٰهُ : مٹاتا ہے اللہ
وَيُثْبِتُ : اور باقی رہنے دیتا ہے (جو وہ چاہتا ہے)
أُمُّ الْكِتٰبِ : اصل کتاب ہے
نُرِيَنَّكَ : ہم دکھا دیں آپ کو
نَعِدُهُمْ : ہم وعدہ کرتے ہیں ان سے
فَإِنَّمَا : پس کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ : اور ہم پر ہے حساب لینا
أَنَّا نَأْتِي : کہ ہم آتے ہیں
نَنْقُصُهَا : گھٹاتے ہوئے اس کو
وَاللّٰهُ يَحْكُمُ : اور اللہ حکم کرتا ہے

لِحُكْمِهِ : اُس کے حکم کو
سَرِيعُ الْحِسَابِ : حساب لینے کا تیز ہے
الَّذِينَ : وہ لوگ جو
فَلِلّٰهِ : تو اللہ ہی کے لیے ہیں
يَعْلَمُ : وہ جانتا ہے
كُلُّ نَفْسٍ : ہر ایک جان
الْكُفَّارُ : کافر لوگ
عُقْبَى الدَّارِ : اس (آخری) گھر کا انجام
الَّذِينَ : وہ لوگ جنہوں نے
لَسْتَ : آپؐ نہیں ہیں
قُلْ : آپؐ کہیے
شَهِيدًا : بطور گواہ کے
وَبَيْنَكُمْ : اور تمہارے درمیان
عِلْمُ الْكِتٰبِ : کتاب کا علم ہے

بِإِذْنِ اللّٰهِ : اللہ کی اجازت سے
كِتَابٌ : لکھا ہوا ہے
مَا يَشَآءُ : اسے جو وہ چاہتا ہے
وَعِنْدَهُ : اور اُس کے پاس ہی
وَإِنْ مَّا : اور اگر
بَعْضَ الَّذِي : اس کے بعض کو جو
أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ : یا ہم اٹھا لیں آپؐ کو
عَلَيْكَ الْبَلٰغُ : آپؐ پر ہے پہنچانا
أَوَلَمْ يَرَوْا : کیا انہوں نے نہیں دیکھا
الْأَرْضَ : زمین کے پاس
مِنْ أَطْرَافِهَا : اس کے کناروں سے
لَا مُعَقِّبَ : (تو) کوئی بھی پیچھے ڈالنے والا نہیں ہے
وَهُوَ : اور وہ
وَقَدْ مَكَرَ : اور چالبازی کر چکے ہیں
مِنْ قَبْلِهِمْ : ان سے پہلے تھے
الْمَكْرُ جَمِيعًا : تمام تدبیریں سب کی سب
مَا تَكْسِبُ : اس کو جو کماتی ہے
وَسَيَعْلَمُ : اور جان لیں گے
لِمَنْ : کس کے لیے ہے
وَيَقُولُ : اور کہتے ہیں
كَفَرُوا : کفر کیا
مُرْسَلًا : بھیجے ہوئے
كَفٰى بِاللّٰهِ : کافی ہے اللہ
بَيْنِي : میرے درمیان
وَمَنْ عِنْدَهُ : اور وہ (بھی) جس کے پاس

(باقی صفحہ 56 پر)

مِلاکُ التأوِیل (۳۴)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃ النحل

(۲۲۱) آیت ۸۴

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾﴾

''اور جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور پھر کُفّار کو نہ اجازت دی جائے گی اور نہ ان سے عذر طلب کیا جائے گا۔''

اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (آیت ۸۹)

''اور جب ہم ہر اُمّت میں سے انہی میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور پھر تمہیں (اے نبی ﷺ!) ان سب پر گواہ بنا کر پیش کریں گے۔ اور ہم نے تم پر کتاب اُتاری ہے جو ہر چیز کو کھول کھول کر بتا دیتی ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں دو جگہ عبارت کا اختلاف ہوا: پہلی آیت میں ''مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ'' اور دوسری آیت میں ''فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ'' وارد ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ پہلی آیت میں ''شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کے الفاظ ہیں اور دوسری آیت میں ''شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ تو اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ پہلی آیت کے بارے میں تو سب کا اتفاق ہے کہ ہر اُمّت میں سے اُس کی طرف مامور کیے گئے نبی کو گواہ بنایا جائے گا جو اہلِ ایمان کی قدر کرے گا اور اہلِ کفر کے کفر کو واضح کرے گا۔

ہاں! دوسری آیت کے مفہوم میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ اکثر مفسّرین تو پہلی آیت اور دوسری آیت میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے، یعنی جس طرح ہر اُمّت میں سے اُس کے نبی کو گواہ بنایا جائے گا، اُسی طرح اُمّتِ مُسلمہ میں سے نبی مکرم محمد ﷺ کو بطور گواہ پیش کیا جائے گا۔ پھر اس آیت میں چند زائد باتیں بھی بیان ہوئیں جن کا تذکرہ ہم بعد میں کریں گے۔

کچھ دوسرے مفسّرین نے کہا کہ دونوں آیتوں کے مفہوم میں فرق ہے لیکن وہ اس فرق کو واضح نہیں کر سکے اور نہ ہی اس کی کوئی قابلِ اعتماد توجیہہ پیش کر سکے۔ چنانچہ مَیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق کی دعا کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ دوسری آیت میں خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کی منقبت بیان ہوئی ہے کہ ایک تو وہ ہر اُمّت کے گواہ کی طرح اپنی اُمّت پر گواہ ہوں گے اور دوسرے یہ کہ انہیں ایک ایسی کتاب دی گئی جو ان کے لیے اور ان کی اُمّت کے لیے ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہاں ''شَهِيْدًا'' کی تکرار نظر آتی ہے۔ یعنی ﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا﴾ کہنے کے بعد پھر آپؐ کا خصوصی تذکرہ ان الفاظ کے ساتھ ہوا: ﴿وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾۔ اس طرح کی تکرار کی کئی مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ مکرّر لفظ اس لیے لایا جاتا ہے تاکہ اس پر ایک نئی بات کا اضافہ کیا جا سکے۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں شعیب علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ﴾ (آیت ۸۸)

''اور ان سرداروں نے کہ جنہوں نے اُس کی قوم میں سے تکبر کا راستہ اختیار کیا تھا' کہا: اے شعیب! ہم تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کریں گے۔''

اور پھر ایک آیت چھوڑ کر ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝۹۰﴾

''اور اُس کی قوم میں سے کفر کی راہ اختیار کرنے والے سرداروں نے کہا: اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو پھر تم بہت نقصان اٹھاؤ گے۔''

اب دیکھئے کہ یہاں ''وَقَالَ الْمَلَاُ'' کی تکرار کی گئی ہے تاکہ ایک دوسری بات کہی جا سکے۔

دوسری مثال: سورۃ البقرۃ میں تحویلِ قبلہ کا حکم آیا۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ﴾ (آیت ۱۵۰)

''اور جس جگہ سے بھی آپ نکلیں تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔''

اور اس سے قبل (آیت ۱۴۴ میں) بھی یہی کہا گیا تھا' لیکن پھر اسی بات کا اعادہ کیا گیا تاکہ ایک دوسرے حکم کو اس کے ساتھ جوڑ دیا جائے' یعنی تم جہاں کہیں بھی جاؤ وہاں بھی یہی حکم ہے کہ مسجد الحرام ہی کی طرف رخ کرو' فرمایا:

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ﴾

''اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں بھی تم ہو تو (نماز کے وقت) اپنے چہروں کو اسی کی جانب پھیر دو۔''

تیسری مثال: سورۃ المؤمنون میں ارشاد فرمایا:

﴿اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝۳۵﴾

''کیا وہ تم سے اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے' مٹّی اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم (پھر سے) نکال

لیے جاؤ گے؟‘‘

ملاحظہ ہو کہ یہاں ’’اَنَّکُمْ‘‘ شروع آیت میں کہا گیا اور پھر دوبارہ اس کا اعادہ کیا گیا تاکہ بات میں مزید زورِ بیان پیدا کیا جا سکے۔ قرآن میں اس قسم کی تکرار کئی جگہ پر واقع ہوئی ہے۔

سورۃ النحل کی آیات میں بھی اسی اسلوبِ بیان کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ پہلے فرمایا کہ اس دن ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور پھر کُفّار کو (بولنے کی) اجازت نہ ہوگی اور نہ ہی انہیں عذر پیش کرنے کا کہا جائے گا۔ اس کے بعد یہی آیت دوبارہ لائی گئی تاکہ اس کے ساتھ نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے بطور گواہ لائے جانے کا ربط پیدا کر دیا جائے اور ان کے منصب عالی کی مزید وضاحت بھی ہو جائے۔ فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿٨٩﴾﴾

’’اور ہم نے تمہارے اوپر کتاب اتاری جو کہ ہر چیز کو واضح کرتی ہے اور باعث ہدایت ہے اور اہلِ اسلام کے لیے رحمت اور خوشخبری ہے۔‘‘

دیکھئے کہ پہلی آیت کے آخر میں کُفّار کی نسبت سے ایک تہدیدی بیان تھا‘ جس میں خوف کا عنصر غالب تھا اور دوسری آیت میں جہاں نبی آخر الزماں ﷺ کا تذکرہ تھا وہاں سلامتی اور اُمید کی جھلک دکھائی دی گئی۔ اور یوں واضح کیا گیا کہ نبی محترم ﷺ کا مرتبہ کتنا اونچا ہے۔ انہیں کس کتابِ عظیم سے نوازا گیا ہے اور اس اُمّت کے لیے کتاب‘ ہدایت اور رحمت کی شکل میں کتنی بڑی خوشخبری عطا کی گئی ہے۔ اور پھر یہ کہ خود نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی اُمّت پر گواہ ہوں گے اور وہ انہی میں سے ایک فرد ہوں گے۔

پچھلی اُمتوں کے انبیاء کے لیے گو ’’مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں اور مراد یہی ہے کہ وہ اپنی قوم کے ایک فرد ہوں گے‘ لیکن یہاں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید وہ بحیثیت نظریہ اور مذہب کے ان میں سے ہوں اور اس لحاظ سے انہیں اسی اُمّت کا ایک فرد قرار دیا گیا ہو‘ البتہ نبی اکرم ﷺ کے ذکر سے قبل بطور خاص ’’فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ‘‘ کے الفاظ لائے گئے۔ ’’فِيْ‘‘ کے حرف میں شمولیت کا عنصر غالب ہے‘ اس لیے اسے حرف بطور ’’وعاء‘‘ (برتن) کہا گیا ہے۔ یعنی پانی برتن کے اندر ہوتا ہے نہ کہ باہر‘ گویا نبی اکرم ﷺ کا جہاں ذکر آیا وہاں کوئی ابہام نہ رکھا گیا۔

یہ سارا بیان نبی اکرم ﷺ کی بڑائی‘ آپؐ کی تعظیم اور آپؐ کی اُمّت کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے سورۃ التوبہ کی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (آیت ۱۲۸)

’’تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں‘ جو باتیں تم پر شاق گزرتی ہیں تو وہ ان پر بھی گراں گزرتی ہیں۔‘‘

اُمید ہے کہ اس تفصیلی بیان سے دونوں آیتوں کے درمیان مناسبت واضح ہو گئی ہوگی۔ واللہ اعلم!

فصل

اکثر مفسرین نے اس آیت کے بارے میں زیادہ کلام نہیں کیا ہے۔ اگر کیا بھی ہے تو اُسے پہلی آیت کی مانند قرار دیا ہے۔ مَیں نے ابوالفضل بن الخطیب کی تفسیر کبیر دیکھی ہے جس میں اس آیت کو موضعِ بحث بنایا گیا ہے' اور امامیہ (شیعہ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں ایک امام معصوم پایا جاتا ہے جو کہ ان پر حُجّت قائم کرتا ہے۔ پھر ابوبکر الاصم (ف ۳۴۶ھ) کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ شہید سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے دس اعضاء یعنی دونوں کان' دو آنکھیں' دو ہاتھ' دو پیروں اور زبان اور کھال کو بولنے کی طاقت عطا کر دیں گے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہید (گواہ) کو ''مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ'' (انہی میں سے) قرار دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اعضاء ان کے اپنے بدن ہی کے تو ہیں۔ (الاصم معتزلی ہیں) اور ان کی اس بات کا جواب ابوبکر محمد بن العطیب باقلانی (ف ۴۰۳ھ) نے دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ قول غلط ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُمّت پر گواہ (شَهِيۡدًا عَلَى الۡاُمَّةِ) کا ذکر کیا ہے' تو اُسے ایک دوسرا شخص ہونا چاہیے (نہ کہ بذاتِ خود یعنی اس کے اعضاء) اور دوسرے یہ کہ اسے اُمّت میں سے (مِنَ الۡاُمَّةِ) قرار دیا ہے اور اعضاء بدن کو اُمّت کا ایک فرد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تفسیر میں صرف یہی کچھ عرض کیا گیا ہے' کسی اور لفظ کی تشریح نہیں کی گئی ہے' اور جو کچھ انہوں نے اس آیت سے مراد لیا ہے اس کا ان باتوں سے دُور دُور کوئی تعلق نہیں ہے۔ مَیں نے وہ کچھ پہلے ہی لکھ دیا ہے جو اس آیت کے معانی و مطالب کو بخوبی واضح کر دیتا ہے۔

اِمامیہ کا یہ کہنا کہ ہر زمانے میں اس آیت کے مطابق امام معصوم کا ہونا ضروری ہے جو ان پر بروزِ قیامت گواہی دے' تو یہ بھی باطل ہے۔ اس کا فاسد ہونا امام باقلانی نے بخوبی واضح کر دیا ہے۔ ایسے ہی الاصم کا قول بھی صحیح نہیں ہے۔ ابوالفضل کا میلان بھی اِمامیہ کے قول کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ یہ تو رسول ہوں گے جو اپنی اپنی اُمتوں پر گواہی دیں گے۔ اور مفسرین نے سورۃ النساء کی اس آیت کا بھی یہی مفہوم قرار دیا ہے:

﴿فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ۝۴۱﴾

''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور تمہیں ان لوگوں پر گواہ بنائیں گے!''

ان تمام آیات کے معانی و مطالب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ واللہ اعلم!

(۲۲۲) آیت ۸۹

﴿وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً وَّبُشۡرٰى لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ ۝۸۹﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے تمہارے اوپر اس کتاب کو اُتارا ہے جو ہر چیز کو بیان کرتی ہے' ہدایت ہے' رحمت ہے اور مسلمانوں کے لیے خوشخبری ہے۔''

اور پھر آیت ۱۰۲ میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾

''کہہ دیجیے کہ اسے روح القدس (جبرائیل) نے تیرے ربّ کی طرف سے اُتارا ہے تاکہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور مسلمانوں کے لیے باعثِ ہدایت اور بشارت بنے۔''

جواباً عرض ہے کہ پہلی آیت سے صرف انعامِ الٰہی کا تذکرہ اور بشارت مقصود ہے' جبکہ دوسری آیت میں مؤمنوں کے لیے بشارت کے پیغام کے ساتھ ایمان نہ لانے والوں کے لیے تنبیہہ اور ڈانٹ بھی مقصود ہے۔ ذرا اس آیت سے ماقبل اور مابعد آیات بھی ملاحظہ ہوں۔ ماقبل آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾﴾

''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں' اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کر رہا ہے' تو وہ کہتے ہیں: بے شک تُو بہتان باز ہے۔ نہیں! ان میں سے اکثر تو کچھ جانتے ہی نہیں۔''

اور اس کے جواب میں پھر مذکورہ آیت نازل ہوئی:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ (آیت ۱۰۲)

''کہہ دیجیے کہ اسے تو تیرے ربّ کی طرف سے روح القدس (جبرائیل) نے حق کے ساتھ اتارا ہے۔''

اور اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۭ﴾ (آیت ۱۰۳)

''ہمیں بخوبی علم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے۔''

اب واضح ہو گیا کہ مذکورہ آیت کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ڈانٹ ڈپٹ بھی ہے اور کفّار کی بداعمالی پر ان کے لیے ایک قسم کی دھمکی بھی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ دونوں آیتوں کا مقصودِ کلام بالکل یکساں نہیں ہے۔ پہلی آیت میں بشارت اور انعام کا تذکرہ ہے تو ''رحمۃ'' کا لفظ لایا گیا اور دوسری آیت میں وعد و وعید ہے تو یہ لفظ یہاں لانا مناسب نہ تھا۔ واللہ اعلم!

(۲۲۳) آیت ۹۶

﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾

''تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ فانی ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ اور جن لوگوں نے صبر کیا ہم انہیں ان کے بہترین اعمال کا بہترین بدلہ بھی ضرور عطا فرمائیں گے۔''

اور اس سے اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾﴾

''جس نے بھی نیک اعمال کیے حالت ایمان میں چاہے مرد ہو یا عورت تو ہم اسے یقیناً نہایت اچھی زندگی عطا فرمائیں گے اور ہم ان کے بہترین اعمال کا بہتر بدلہ بھی ضرور عطا فرمائیں گے۔''

اور سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۳۵﴾

''تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے برے اعمال کو ان سے دُور کر دے اور جو نیک کام انہوں نے کیے ہیں ان کا بہترین بدلہ ادا کرے۔''

اس آیت میں سورۃ النحل میں وارد ''مَا'' کی جگہ ''الَّذِیْ'' لایا گیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ''مَا'' اور ''الَّذِیْ'' دونوں اسم موصول کا مفہوم رکھتے ہیں لیکن ''مَا'' میں عمومیت کا پہلو غالب ہے۔ اور پھر یہ کہ ''مَا'' بعض دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے شرط اور استفہام، اور ان دونوں استعمالات میں وہ عمومیت اور اطلاق (یعنی بغیر کسی قید کے) کا فائدہ دیتا ہے۔

ایسے ہی وہ بطور صفت، نکرہ موصوفہ یا تعجب کی غرض سے بھی لایا جاتا ہے۔ اور جہاں تک ''الَّذِیْ'' کا تعلق ہے تو اس کا موصول ہونا یا بطور عہد (یعنی جو چیز پہلے بیان کی جا چکی ہے اس کی طرف اشارہ کرنا) لایا جانا بنسبت جنس (یعنی وہ اسم جس کے تحت کئی انواع ہوں) زیادہ معروف ہے۔

اب دیکھئے پہلی آیت میں ''مَا'' تین دفعہ لایا گیا ہے اور اس میں حصر بھی ہے (یعنی جس چیز کا تذکرہ ہو رہا ہے وہ پوری کی پوری مراد ہے) اور عمومیت بھی ہے۔ فرمایا: ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ﴾ یعنی جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جانے والا ہے اور جو کچھ بھی اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا۔ اور اس لحاظ سے یہاں ''مَا'' کا لایا جانا ''الَّذِیْ'' سے زیادہ مناسب تھا تاکہ عموم اور اطلاق دونوں مراد ہو سکیں۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اگر ''مَا'' شرط یا استفہام کے لیے ہو تو پھر عموم اور اطلاق ہر صورت باقی رہے گا۔ البتہ باقی استعمالات میں اشتراک کا عنصر پایا جانا جائز ہے۔ بعض اہل نظر کے نزدیک عموم سے مراد یہ ہے کہ اس میں شراکت کے مفہوم کی نفی کی گئی ہے۔ بہرصورت ''مَا'' کے معنی میں وسعت پائی جاتی ہے۔ آیت کے آخر میں ﴿بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝﴾ کہا، اور یہاں بھی ''مَا'' کا استعمال آیت میں موجود وسعت ہی کی پاسداری کرتا ہے، اور یہ مفہوم ''الَّذِیْ'' سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسری آیت ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى﴾ گو پچھلی آیت ہی کی مانند ہے لیکن ''مَنْ'' کا یہاں لایا جانا ''الَّذِیْ'' سے زیادہ مناسب ہے۔ ''مَا'' کی طرح ''مَنْ'' بھی کئی دوسری طرح استعمال ہو سکتا ہے۔ جیسے استفہام، نکرہ، موصوفہ، یا مبہم ہونا، لیکن ''الَّذِیْ'' ان تمام معنوں میں استعمال نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ تعریف (کسی چیز کو متعارف کرانے) کے معنی سے ہٹ نہیں سکتا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ ''الَّذِیْ'' شرط کے لیے بھی آ سکتا ہے، مثلاً آپ یہ کہیں: ''اَلَّذِیْ یَأْتِیْنِیْ فَلَهٗ دِرْهَمٌ'' (جو میرے پاس آئے گا تو اس کے لیے ایک درہم ہے)۔ یہاں خبر کے اوپر ''فاء'' کا لایا جانا اس بات کی دلیل

ہے کہ ''الَّذِیْ'' بمعنی شرط کے ہے! جواباً میں کہوں گا کہ یہ استعمال بعض معلوم ومعروف شرائط کے ساتھ ہی ہوسکتا ہے' اور اگر یہ شرطیں نہ پائی جائیں تو پھر ''مَنْ'' ''الَّذِیْ'' سے جدا ہو جاتا ہے۔ بہرصورت اس آیت میں ''مَنْ'' کے بعد ﴿مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى﴾ کہہ کر عموم کا معنی پیدا کر دیا گیا' یعنی جو بھی نیک اعمال کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت' اور چونکہ اس آیت میں (بطور عمومیت) پچھلی آیت سے کوئی فرق نہ تھا اس لیے آیت کے آخر میں ''مَا'' ہی کو دوبارہ لایا گیا۔ فرمایا: ﴿بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۷﴾

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان ہر دو آیات میں ''مَا'' کا لانا ہی مناسب تھا نہ کہ ''الَّذِیْ'' کا۔ اور یہ دقیق استعمال ہر کسی کے بس میں نہیں' یہ صرف کلامِ الٰہی کا اعجاز ہے۔ اور جہاں تک سورۃ الزمر کی آیت کا تعلق ہے تو وہاں خاص خاص افراد مراد ہیں۔ مذکورہ آیت سے پہلے فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۳۳﴾ ''اور جو سچا دین لے کر آیا اور جس جس نے اس کی تصدیق کی' وہی سب پارسا ہیں''۔ جو سچے دین کو لے کر آئے وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور جنہوں نے اس کی تصدیق کی وہ اوائل صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جن میں سرفہرست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان جیسے دوسرے صحابہؓ ہیں جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں' اور ان اوصاف میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے پھر جمع کی ضمیر لائی گئی: ﴿هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ وہی پارسا ہیں۔ ﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (آیت ۳۴) ''ان کے لیے وہ کچھ ہے جو وہ چاہیں ان کے ربّ کے پاس۔'' ﴿لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا﴾ ''تاکہ اللہ ان سے ان کے بُرے اعمال کو ہٹا دے'' ﴿وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۳۵﴾ ''اور انہیں اچھا بدلہ دے ان تمام کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے''۔ دونوں جگہ ''الَّذِیْ'' لایا گیا جو کہ عہد پر دلالت کرتا ہے یعنی جو گروہ پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں اس اعتبار سے ''الَّذِیْ'' کا لایا جانا ہی مناسب تھا نہ کہ ''مَا'' کا۔ واللہ سبحانہٗ أعلم۔

سُورۃ بنی اسرائیل (الاسراء)

(۲۲۴) آیت ۴۱

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝۴۱﴾

''اور ہم نے اس قرآن میں ہر مثال کو پھیر پھیر کر بیان کر دیا ہے تاکہ وہ لوگ نصیحت حاصل کر سکیں' لیکن یہ سب کچھ انہیں مزید بھاگنے پر ہی آمادہ کرتا رہتا ہے۔''

اور پھر آیت ۸۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۸۹﴾

''اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر مثال کو پھیر پھیر کر بیان کیا ہے' لیکن اکثر لوگوں نے انکار ہی کیا اور ناشکری کا راستہ اختیار کیا۔''

اور سورۃ الکہف (آیت ۵۴) میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝۵۴﴾

''اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر مثال کو گونا گوں انداز میں بیان کیا۔ اور انسان تو بہت ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔''

ملاحظہ ہو پہلی آیت میں صرف ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ کہا گیا۔ دوسری آیت میں ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ وارد ہوا' جبکہ تیسری آیت میں ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ﴾ ذکر کیا گیا یعنی ''النَّاس'' کو آخر میں رکھا گیا۔ تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے' واللہ اعلم' کہ پہلی آیت سے قبل ارشاد فرمایا تھا:

﴿اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنَاثًا ۭ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝۴۰﴾

''کیا تمہارے ربّ نے تمہارے لیے تو بیٹوں کو چُن لیا ہے اور خود فرشتوں کو بطور بیٹیاں رکھ لیا ہے؟ بے شک تم بہت بڑا بول بول رہے ہو۔''

یہاں کُفّارِ عرب سے خطاب ہے اس لیے یہاں ''النَّاس'' کا لفظ نہیں لایا گیا کہ اس میں عرب اور غیر عرب سب مراد ہو سکتے ہیں' تاکہ خطاب اہلِ عرب کے ساتھ ہی خاص رہے۔ اور جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے تو اس سے قبل فرمایا گیا تھا:

﴿قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸﴾

''کہہ دیجیے کہ اگر کُل انسان اور جِنّات مل کر بھی اس قرآن کا مثل لانا چاہیں تو وہ اس کا مثل نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔''

اور پھر فرمایا: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ﴾ یعنی پہلے تو دونوں فریقین کا ذکر کیا گیا یعنی جِنّات اور انسان' پھر خاص طور پر انسانوں کا ذکر کیا گیا تاکہ جِنّات کے مقابلے میں ان کی اہمیت کو اُجاگر کیا جا سکے۔ اور لفظ لِلنَّاسِ (جار اور مجرور) کو جب پہلے لایا جاتا ہے تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

یہاں ایک نکتہ اور بھی ہے' پہلی آیت میں ''فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ'' کا لفظ آ چکا ہے' اور اس دوسری آیت میں بھی اگر ''فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ'' پہلے رکھا جاتا تو تکرار کی بنا پر اسے ثقیل گردانا جاتا' لہٰذا اس سے قبل ''لِلنَّاسِ'' کہہ کر دونوں آیات میں ذرا سا فرق پیدا کر دیا گیا جس کی وجہ سے اسے ثقیل نہیں محسوس کیا جائے گا۔

جہاں تک سورۃ الکہف کی آیت کا تعلق ہے تو وہاں لفظ ''النَّاس'' کی تکرار نہیں کی گئی اس لیے ''فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ'' کو پہلے لایا گیا' کیونکہ وہاں مقصود نصیحت و عبرت تھی کہ جس کے لیے قرآن کا ذکر ہی مقدم کیا جانا چاہیے تھا۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ وہاں اس آیت سے قبل جِنّات اور انسانوں کا ذکر نہیں کیا گیا کہ آیت سورۃ الاسراء کی طرح ''لِلنَّاس'' پہلے لا کر انسانوں کی خصوصی حیثیت کو بیان کیا جاتا۔ ملاحظہ ہو کہ سورۃ الکہف کی مذکورہ آیت

سے قبل یوں خطاب کیا گیا تھا: ﴿ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ ﴾ (الکہف:۵۲) ''اور جس دن وہ کہے گا: پکارو میرے شریکوں کو جن کو تم مانتے ہو۔'' یعنی اس کا سیاق وسباق سورۃ الاسراء کی آیت سے مختلف ہے۔ اس لیے یہاں قرآن کا ذکر مقدم رکھا' کیونکہ قرآن ہی وہ کتاب ہے کہ جس کی آیات سے عبرت اور موعظت حاصل ہوتی ہے۔ اور چونکہ آخری دونوں آیات میں عمومی خطاب ہے اس لیے دونوں میں ''النَّاس'' کا لفظ لایا گیا برخلاف پہلی آیت کے' جس کے مخاطب عرب کے کُفّار تھے کہ جنہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں' نعوذ باللہ! اللہ کی ذات اس سے بالا و برتر ہے۔ اور اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ ہر ایک آیت کی اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے مناسبت پائی جاتی ہے۔

اب ہر آیت کے اختتامی الفاظ ملاحظہ ہوں: پہلی آیت میں کُفّارِ عرب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ہم نے یہ قرآن اسی لیے اتارا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کر سکیں اور پھر ﴿ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ ﴾ کہہ کر بتایا گیا کہ وہ قرآن سنتے ہیں لیکن قرآن کا سننا ان کے لیے مزید بدکنے اور راہِ فرار اختیار کرنے ہی کا باعث بنتا ہے۔ یہاں ''وَمَا يَزِيْدُهُمْ'' میں ان کی طرف اشارہ کرنے کے لیے صرف ضمیر لائی گئی ہے کہ جس سے مراد وہی لوگ ہیں جن سے خطاب کیا جا رہا ہے۔

دوسری آیت کے اختتامی کلمات ہیں: ﴿ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾ ﴾ یہاں ضمیر کی جگہ ''النَّاس'' کا لفظ لایا گیا' کیونکہ صرف ضمیر لانے سے خطاب میں وہ شدت اور ڈانٹ ڈپٹ نہ پیدا ہوتی جو اسم ظاہر لانے میں ہوتی ہے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ اے لوگو! ہم نے تو تمہیں جنّات کے مقابلے میں شرف اور فضیلت عطا کی تھی لیکن تم نے اس کے جواب میں ناشکری کا رویہ اختیار کیا؟ اور یوں ''النَّاس'' کہہ کر انہیں اس خطاب میں معتوب قرار دیا گیا۔

سورۃ الکہف کی آیت کے اختتام پر ارشاد ہوا: ﴿ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ ﴾ ''اور انسان تو جھگڑا کرنے کے لحاظ سے سب چیزوں میں سبقت رکھتا ہے۔'' اب یہ تو ایک بدیہی سی بات ہے کہ ہر کافر اور دین سے بیزار شخص اپنے آپ کو حق بجانب گردانتے کے لیے خوب حُجّت بازی کرتا ہے۔ سورۃ الانفال میں اُن اہلِ ایمان کا تذکرہ ہے جو جہاد پر جاتے وقت جھگڑا کر رہے تھے۔ فرمایا:

﴿ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۶﴾ ﴾

''اور وہ تجھ سے ایک حق بات میں جھگڑا کرتے تھے جبکہ ان کے لیے یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں۔''

اب جبکہ یہ بات تو طے ہو گئی کہ ہر شخص اپنے مذہب اور اپنے اعتقاد کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتا اور پھر اپنے دفاع میں خوب جھگڑتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں (سورۃ الکہف میں) جدال کا کون سا موقع تھا کہ جس کی بنا پر ''جدال'' کا خصوصی ذکر کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت (۵۴) کے بعد کہا جا رہا ہے:

﴿ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ﴾ (آیت ۵۶)

''اور کُفّار ناحق جھگڑا کرتے ہیں تاکہ وہ اس سے حق کو ٹلا سکیں۔''

گویا پہلی آیت دوسری آیت کے لیے تمہید بن گئی۔ اس کے برخلاف پہلی دونوں مثالوں میں ایسی کوئی بات نہیں کی گئی تھی کہ جس کی بنا پر ''جدال'' کا تذکرہ کیا جاتا' اس لیے ان کا اختتام موضوع کی مناسبت سے نُفُور (بدکنا) اور کُفُور (ناشکری) پر کیا جانا عین مناسب تھا۔

(۲۲۵) آیت ۵۶

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝۵۶﴾

''کہہ دیجیے: پکارو اُن کو جنہیں تم اللہ کے سوا مانتے ہو' تو نہ وہ تمہاری تکلیف کا ازالہ کر سکیں گے اور نہ ہی تمہاری حالت بدل سکیں گے۔''

اور سورۂ سبا میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ﴾ (آیت ۲۲)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ان مشرکین سے) کہیے کہ تم بلاؤ اُن کو جنہیں تم نے (معبود) گمان کیا ہے اللہ کے سوا۔ وہ ذرّہ برابر بھی اختیار نہیں رکھتے' نہ آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں۔''

سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ سورۃ الاسراء میں ذاتِ الٰہی کا ذکر بطور ضمیر (مِنْ دُوْنِهٖ) کیا گیا ہے لیکن سورۃ سبا میں اسے ظاہر کر دیا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ سبا کی آیت سے قبل کُفّار کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: ﴿وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ﴾ (آیت ۲۰) ''اور ان کے بارے میں شیطان نے اپنا گمان سچ کر دکھایا اور ان لوگوں نے اس کی پیروی کی۔'' اور پھر اس کے بعد مذکورہ آیت آئی ہے جس میں کہا گیا کہ ''کہہ دیجیے کہ تم اللہ کے سوا جن جن کو مانتے ہو ان کو پکار کے دیکھ لو' وہ تو آسمانوں اور زمین میں ذرّہ برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔''

یہاں ''اللہ'' کا اسم ظاہر بیان کیا گیا' کیونکہ اگر یہاں ضمیر لائی جاتی تو یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے جسے وہ لوگ پکارتے تھے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ ابلیس جو کہ تمام گمراہ سرداروں کا سردار ہے' اسے پکار کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی کیا حیثیت اور طاقت ہے۔ اس لیے یہاں باری تعالیٰ کا اسم ظاہر لانا ضروری تھا۔

اب رہی سورۂ بنی اسرائیل کی آیت تو اس سے قبل ارشاد ہوا تھا: ﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ﴾ (آیت ۵۴) ''اور تمہارا رب تم سے خوب واقف ہے' وہ چاہے تو تم پر رحمت کرے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے۔'' اور پھر فرمایا: ﴿وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ (آیت ۵۵) ''اور تمہارا رب بخوبی واقف ہے ان سب سے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔'' اور اس کے بعد مذکورہ آیت آتی ہے: ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ﴾ تو یہاں ضمیر کا لانا بالکل مناسب تھا کہ اس سے

قبل دو دفعہ ''رَبُّکُمْ '' کا ذکر ہو چکا ہے تو پھر ضمیر ''رب'' ہی کی طرف لوٹائی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ سورۃ الاسراء میں بھی تو ان آیات سے قبل شیطان کا ذکر ہے: ﴿اِنَّ الشَّیۡطٰنَ یَنۡزَغُ بَیۡنَہُمۡ ؕ﴾ (آیت ۵۳) ''بے شک شیطان ان کے درمیان فساد ڈلواتا ہے''۔ تو پھر سورۂ سبا ہی میں کیوں اللہ کا اسم ظاہر لایا گیا' سورۃ الاسراء کی طرح ضمیر پر کیوں نہ اکتفا کیا گیا؟ مَیں کہوں گا کہ دونوں آیات کا سیاق و سباق مختلف ہے۔ سورۃ الاسراء میں شیطان کا ذکر تو ہے لیکن اس سے ڈرایا گیا ہے' اس کے فتنہ و فساد ڈلوانے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس آیت میں اہل ایمان کو مخاطب کیا گیا ہے:

﴿وَقُلۡ لِّعِبَادِیۡ یَقُوۡلُوا الَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ﴾ (آیت ۵۳)

''اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ بہترین بات کہیں۔''

''عِبَادِیۡ '' کہہ کر اہلِ ایمان کو عزت بخشی گئی ہے' انہیں ایک اچھی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اس قسم کا حکم صرف اہلِ ایمان ہی کو دیا جا سکتا ہے' اور پھر اس کے بعد وہ کلمات آئے ہیں جو اس سیاق سے خوب مناسبت رکھتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں سورۂ سبا کو دیکھ لیں کہ جس میں شیطان کا ذکر آیت سے بالکل متصل ہے' ابلیس کی دجالیت کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس کو پکارا گیا تھا۔ اور جیسا اُس نے اپنے پیروکاروں کے بارے میں گمان کیا تھا تو وہ پورا ہوا۔ یہاں سارے کا سارا کلام کُفّار کے بارے میں ہے اور پھر اس کے بعد مذکورہ آیت آتی ہے: ﴿قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ ﴾ (آیت ۵۶) اس لیے اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ دونوں آیات اپنی اپنی جگہ بہت مناسبت رکھتی ہیں اور اگر اس کا الٹ ہوتا تو وہ کتابِ الٰہی کے نظم اور ترتیب سے قطعاً کوئی مناسبت نہ رکھتا' واللہ اعلم!

(۲۲۶) آیات ۶۸۔۶۹

﴿اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ یُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ وَکِیۡلًا ﴿۶۸﴾﴾

''کیا تم اس بات سے بے خوف ہو چکے ہو کہ وہ تمہیں خشکی کی طرف لے جا کر ایک طرف دھنسا دے یا تم پر پتھروں کی آندھی بھیج دے' اور پھر تم اپنے لیے کوئی نگہبان نہ پا سکو۔''

﴿اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ یُّعِیۡدَکُمۡ فِیۡہِ تَارَۃً اُخۡرٰی فَیُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیۡحِ فَیُغۡرِقَکُمۡ بِمَا کَفَرۡتُمۡ ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ عَلَیۡنَا بِہٖ تَبِیۡعًا ﴿۶۹﴾﴾

''یا تم اس بات سے بے خوف ہو چکے ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ پھر سمندر کے سفر پر لے آئے اور پھر تمہارے اوپر تیز و تند ہوا مسلط کر دے' پھر وہ تمہیں تمہارے کفر کی بنا پر غرق کر دے' پھر ہم سے تمہارے بارے میں کوئی پوچھنے والا بھی باقی نہ رہے۔''

پھر آیت ۷۵ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِذًا لَّاَذَقۡنٰکَ ضِعۡفَ الۡحَیٰوۃِ وَضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیۡنَا نَصِیۡرًا ﴿۷۵﴾﴾

''پھر تو ہم تمہیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی دُہرا عذاب چکھائیں گے' پھر تم ہمارے مقابلے میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ گے۔''

اور پھر آیت ۸۶ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿٨٦﴾﴾

''اور اگر ہم چاہیں تو جو وحی ہم نے تم پر اتاری ہے اسے سلب کر لیں اور پھر تمہیں ہمارے مقابلے میں (اسے واپس لانے کے لیے) کوئی حمایتی میسر نہ ہو۔''

یہاں چار آیات ہیں جن کا اختتام مختلف الفاظ پر ہوا ہے۔ پہلے میں کہ تم کوئی وَکِیل (نگہبان) نہ پاؤ گے۔ دوسری میں کہ تم کوئی تَبِیع (پوچھ گچھ کرنے والا) نہ پاؤ گے۔ تیسری میں کہ تم کوئی نصیر (مددگار) نہ پاؤ گے۔ اور چوتھی میں کہ تم کوئی وَکِیل (حمایتی' نگہبان) نہ پاؤ گے۔ تو اس اختلاف کی کیا وجہ ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ ہر آیت کے ماسبق کے حساب سے یہ الفاظ لائے گئے ہیں۔ پہلی آیت سے قبل اس بات کا ذکر تھا کہ جب تم سمندر میں سوار ہوتے ہو اور وہاں کوئی مصیبت آ پہنچتی ہے تو تمہارے دیوتا کہ جن کو تم پکارتے ہو سب غائب ہو جاتے ہیں سوائے اللہ کے۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تم کو بعافیت خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو تم اپنا منہ پھیر لیتے ہو۔ انسان پھر بھی ناشکری سے باز نہیں آتا۔ یہ بات اس آیت کی ترجمانی کرتی ہے:

﴿وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿٦٧﴾﴾

اور اسی بات کو سورۃ النحل میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــَٔرُوْنَ ﴿٥٣﴾﴾

''اور جتنی بھی نعمتیں تمہارے پاس ہیں اللہ کی عطا کردہ ہیں' پھر جب تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو تم اسی سے نالہ و فریاد کرتے ہو۔''

﴿ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾﴾

''پھر جب وہ تکلیف کو تم سے ہٹا دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ پھر اپنے رب کے ساتھ شرک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔''

اب جبکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے سمندر کے طوفان سے بچا کر خشکی تک پہنچا دیا تو انسان کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا لیکن وہ ناشکری سے باز نہیں آتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب تو مَیں زمین تک پہنچ گیا ہوں تو بے خوف ہو چکا ہوں۔ لیکن یہ اس کی خوش فہمی ہے۔ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ جس زمین کے ٹکڑے کو وہ برّاماں سمجھتا ہے اسے ہی اللہ دھنسا دے اور وہ اس میں دفن ہو کر رہ جائے۔ یا پھر آسمان کی طرف سے کنکروں' پتھروں کا ایسا طوفان نازل ہو کہ وہ فنا ہو کر رہ جائے' تو پھر بتاؤ کہ اللہ کے سوا تمہارا اور کوئی نگہبان ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد فرمایا:

﴿اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ﴾ (آیت ۶۹) یعنی کیا تم اس بات سے بے خوف ہو چکے ہو کہ پھر دوبارہ اللہ

تمہیں سمندری سفر کا موقع دے تو پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمہاری کشتی پر تیز و تُند ہوا کا طوفان بھیج دے اور تم بچ نہ پاؤ‘ کشتی بھی ڈوبے اور تم بھی اس کے ساتھ ڈوب جاؤ۔ اور تمہارے پیچھے کوئی تمہارا والی وارث ایسا نہیں جو تمہارے بارے میں پوچھے اور ہم سے قصاص کا مطالبہ کرے۔ اور اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا: ﴿ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿٦٩﴾﴾ یہ لفظ (تَبِیْع) پیچھے آنے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ جیسے کہا گیا: ﴿فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرۃ:۱۷۸) ’’پس بھلائی کے ساتھ معاملہ کرے۔‘‘

یہاں قتل کے واقعہ میں قصاص کا بیان ہو رہا ہے کہ قاتل کو قتل کیا جائے اِلّا یہ کہ مقتول کے ورثاء قاتل کو معاف کر دیں۔ ایسی صورت میں اس نیکی کے پیچھے قاتل کے اہلِ خانہ کی طرف سے بھی نیکی کی جائے اور دیت ادا کر کے نیکی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے۔ گویا تابع یا تبیع اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو بعد میں آئے۔ اب دیکھئے کہ پہلی آیت میں اس بات کا امکان تھا کہ جس شخص کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اسے خشکی میں دھنسا دیا جائے یا آندھی کا طوفانِ بلاخیز اسے گھیر لے‘ وہاں اس بات کا امکان ہے کہ کوئی شخص اسے آ کے بچا لے۔ اس لیے وہاں ’’وکیل‘‘ (نگہبان) کا لفظ استعمال کیا کہ تم اس صورت میں کوئی نگہبان نہ پاؤ گے۔ دوسری صورت میں کہا گیا کہ انہیں غرق کر دیا جائے گا‘ یعنی بچنے کا کوئی امکان نہ ہوگا اور پھر تمہارے بعد تمہارے بارے میں کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوگا۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ ہر دو آیات کے اختتامی کلمات آیت میں ذکر کردہ حالات سے پوری موافقت رکھتے ہیں اور اگر اس کا اُلٹ کیا جاتا تو وہ قطعاً مناسب نہ ہوتا۔

اب آیئے‘ تیسری آیت کی طرف! اس میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ کُفّار تو چاہیں گے کہ آپ کو وحی کے معاملہ میں بہکا دیں تاکہ آپ ہمارے اوپر جھوٹ باندھ سکیں۔ وہ تو ہم نے تمہیں ثابت قدم رکھا‘ وگرنہ تم تو ان کی طرف جھک سکتے تھے۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو تمہاری عظیم شخصیت کے مطابق تمہیں دنیا اور آخرت دونوں میں دُہرا عذاب سہنا پڑتا۔ اور آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوا: ﴿ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾﴾ ’’پھر تم ہمارے مقابلے میں کسی مددگار کو نہ پاتے۔‘‘ ایک شخص اگر مصیبت میں ہو اور اس کی پکڑ کسی طاقتور ہستی کے ہاتھ میں ہو تو انسان اس پکڑ سے بچنے کے لیے کسی مددگار کی تلاش کرتا ہے‘ اس لیے یہاں ’’نَصِیْرًا‘‘ (مددگار) کا لفظ لانا انتہائی موزوں تھا۔

اور چوتھی آیت میں یہ بات بیان ہو رہی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو وحی کو آپ سے سلب کر لیں‘ یعنی جو کچھ آپ کے سینے میں محفوظ ہو چکا تھا‘ اُسے مٹا ڈالیں: ﴿ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿٨٦﴾﴾ ’’اور پھر تم ہمارے مقابلے میں کسی اور کو نگہبان نہ پاؤ گے۔‘‘ یہاں یہ صورتِ حال نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی مصیبت کا شکار ہے اور اسے مددگار کی ضرورت ہے بلکہ ایک نگہبان (وکیل) کی ضرورت کا احساس دکھائی دیتا ہے‘ جیسے کہیں خزانہ رکھا ہے کہ جس کے باہر ایک پہرے دار مقرر ہے‘ اور پھر وہ خزانے کی حفاظت نہ کر پائے۔ اس لحاظ سے ان آخری دو آیات کے اختتامی کلمات بھی بڑے معنی خیز ہیں اور اپنی اپنی جگہ نہایت مناسبت رکھتے ہیں۔

❁❁❁

ٹیکنالوجی نے ہمیں کیسے تبدیل کیا؟

ڈاکٹر محمد رشید ارشد

(دسمبر ۲۰۲۲ء میں کراچی کی ایک علمی مجلس میں گفتگو)

الحمد للّٰہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبیَّ بعدہ' رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَ يَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ

ویسے تو یہ ایک بہت وسیع موضوع ہے لیکن کوشش ہوگی کہ اختصار کے ساتھ لفظ ''ٹیکنالوجی'' کا تعارف اور اس کے اثرات واضح کیے جاسکیں۔ عنوان میں بنیادی طور پر تین کلیدی الفاظ ہیں' انہی سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔ ایک لفظ ہے ''ہم''، دوسرا لفظ ہے ''ٹیکنالوجی'' اور تیسرا لفظ ہے ''تبدیلی''۔

''ہم'' کون ہیں؟

اس وقت دنیا میں بنیادی اکائی self ہے' person ہے' یا اس کے لیے ایک لفظ human استعمال ہوتا ہے۔ ہم بنیادی طور پر انسان ہیں' اور فلاں فلاں چیزیں گویا انسانیت کے لیے مسئلہ ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ٹیکنالوجی کے حوالے سے پوری دنیا میں یہ گفتگو ہو رہی ہے کہ اس نے انسانیت یا انسانوں کو کیسے تبدیل کیا ہے اور اس پر کیسے اثر انداز ہو رہی ہے! دنیا کے بڑے مفکّرین اور فلسفیوں کے ہاں اس وقت ایک بڑا مسئلہ Dehumanization ہے' یعنی انسان ہونے کا مطلب اب کیا ہوگا؟ UNESCO مختلف دن مناتی ہے' جن میں ایک '' World Philosophy Day'' بھی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے نومبر کی تیسری جمعرات مقرر کر رکھی ہے۔ یونیسکو والے ہر سال اس کا کوئی نہ کوئی theme بھی دیتے ہیں۔ اس سال کا موضوع تھا: '' The Forthcoming Human''، یعنی آگے آنے والا انسان کیسا ہوگا! لوگوں کے اندر ایک احساس پیدا ہو رہا ہے کہ انسان ہونے کا جو مطلب افلاطون سے کانٹ اور کانٹ سے مشل فوکو تک سمجھا جاتا تھا' کیا آج کے انسان پر وہ definitions عائد کی جاسکتی ہیں؟ Humanity کو بھی ایک خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔

جہاں بھی دنیا کے کچھ مفکّرین جمع ہوتے ہیں اور یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس وقت انسانیت یا دنیا کو کون سے بڑے خطرات لاحق ہیں تو ان میں سے بھی زیادہ تر کا تعلق سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بڑا مسئلہ Nuclear Catastrophe یا Nuclear Warfare کا ہے۔ اسی طرح ایک بڑا مسئلہ ماحولیاتی تبدیلی کا ہے۔ ایک مسئلہ انسان کی بیگانگی یعنی Human Alienation یا انسان کے نفسی مسائل ہیں۔ جو تین

چیزیں آپ کے سامنے رکھی گئی ہیں‘ غور کریں تو ان تینوں کے پیچھے ٹیکنالوجی ہی کا ہاتھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری دنیا میں مفکّرین اور فلسفی ٹیکنالوجی کو problematize کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمیں بلاوجہ واہمہ ہو گیا ہے کہ ٹیکنالوجی انسانوں کے لیے یا انسانیت کے لیے خطرہ ہے‘ بلکہ اس پر بات ہو رہی ہے اور ہر جگہ ہو رہی ہے۔

لوگوں کے نزدیک بنیادی unit ’’انسان‘‘ ہے‘ اور اصل میں تو ہم انسان ہی ہیں۔ اسی وجہ سے ایک خاص طرح کا humanism ہمارے ہاں بھی پھیل رہا ہے اور یہ بات لوگ کہنے لگے ہیں کہ اصل میں سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے۔ البتہ میں نے موضوع میں جو لفظ ’’ہمیں‘‘ رکھا ہے اس میں مَیں ’’ہم‘‘ کو انسان کے طور پر نہیں دیکھتا‘ یعنی میری ناقص رائے میں ہمارا basic essence ’’انسان‘‘ ہونا نہیں بلکہ ’’بندہ‘‘ ہونا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ essentially ہم انسان ہیں۔ دراصل essentially ہم بندے ہیں۔ یہ ایک پرانا تصوّر ہے۔ انسان کا ایک essence ہوتا ہے‘ کچھ accidents ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ لگے ہوتے ہیں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے بنیادی طور پر وجود دو ہی ہیں: ایک ’’اللہ‘‘ اور ایک ’’ماسوا اللہ‘‘۔ اللہ اور ماسوا اللہ میں ایک ہی تعلق ہے اور وہ یہ کہ اللہ ’’معبود‘‘ ہے جبکہ ماسوا اللہ سب کے سب ’’عبد‘‘ ہیں۔ میرا انسان ہونا ایک accident ہے اور میرا بندہ ہونا essence ہے۔ میں اگر انسان نہ ہوتا تو جانور‘ پیڑ پودا‘ پتھر وغیرہ یا کچھ بھی ہوتا‘ جس کو قرآن مجید ’’شَے‘‘ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ اصل میں شَے ہے۔ ما شاءَ اللّٰہُ فھو شيءٌ یعنی جو اللہ نے چاہا گویا وہ شَے ہے۔ میں توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ ’’ہم‘‘ سے مراد کون ہیں!

ہم ’’عباد اللہ‘‘ یعنی اللہ کے بندے ہیں۔ ہمیں کسی بھی مسئلے پر غور محض انسانیت کے رخ سے نہیں کرنا بلکہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ کوئی چیز ہماری بندگی کو کیسے affect کرتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کا مطلب ’’عبد‘‘ ہے اور ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔ تمام مخلوقات اللہ کی بندی یا بندے ہیں۔ البتہ مخلوقات کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کو free will حاصل ہے۔ دوسری وہ جس کو free will حاصل نہیں ہے۔ ایک عبادت بالاجبار یا بالتسخیر ہے جو سب کو کرنی ہے۔ ایک عبادت بالخیار ہے یا عبادت بالاختیار کہہ لیں‘ اس کا حکم ان لوگوں کو دیا گیا ہے جن کو free will دی گئی ہے اور قرآنِ مجید میں یہ موضوع مذکور ہے:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾﴾ (الاحزاب)

’’بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس امانت کو اٹھا لیا۔ یقیناً وہ زیادتی کرنے والا‘ بڑا نادان ہے۔‘‘

میر کا شعر ہے: ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی　　اُس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

جتنا ہمیں علم ہے‘ دو مخلوقات کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ مکلّف ہیں‘ یعنی ’’انسان‘‘ اور ’’جِنّات‘‘۔ ان کو free will حاصل ہے‘ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندگی سے انکار کر سکتے ہیں۔ وہ بندگی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں قصۂ آدم وابلیس سات مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ علماء اس کی بہت سی حکمتیں بیان کرتے ہیں لیکن ایک بہت بڑی حکمت جو اس قصے کے ذریعے ہمارے سامنے آتی ہے وہ human free will کا اظہار ہے۔ درحقیقت free will کا اظہار بات ماننے میں نہیں ہوتا‘ اس کا اظہار نافرمانی میں ہوتا ہے۔ فرشتے free will رکھتے ہیں یا نہیں‘ اس حوالے سے قرآن مجید کہتا ہے: ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝۶﴾ (التحریم) ’’وہ احکامات کی نافرمانی نہیں کرتے‘ اور جو اُن سے کہا جاتا ہے وہ کرتے ہیں۔‘‘ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ free will ظاہر ہوتی ہے نافرمانی سے۔ آدم وحوا علیہما السلام دونوں کو منع کیا گیا تھا کہ آپ فلاں درخت کے پاس نہیں جائیں گے‘ لیکن وہ چلے گئے۔ اب اس پورے واقعے میں کتنی حکمتیں ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن ایک بہت بڑی حکمت آدم علیہ السلام کی free will کا اظہار ہے کہ آدم وہ ہے جو معصیت کر سکتا ہے۔ انسان صرف انکار ہی نہیں کر سکتا‘ اس کے اندر سرکشی اور تمرد کا بیج بھی ہے‘ یہاں تک کہ انسان خدا کے مقابل بھی آ سکتا ہے اور وہ خدائی اور الوہیت کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ اس کا ذکر آگے ہوگا کہ ٹیکنالوجی سے اس کا کیا تعلق ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ ’’ہم‘‘ سے مراد یہاں پر بندے ہیں‘ اور ہماری سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ ضمنی شناخت جڑی ہوئی ہے کہ ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت ہیں۔

ٹیکنالوجی کا روایتی تصوّر

اگلی بات یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کو روایتی طور پر کیسے دیکھا جاتا ہے! ماڈرن ٹیکنالوجی کیا ہے؟ اس کی dynamics کیا ہیں؟ ٹیکنالوجی کا original تصوّر کیا تھا؟ مثال کے طور پر اگر ہم فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ارسطو نے مقاصدِ علم متعین کیے کہ علم یا زندگی کے مقاصد کیا ہیں۔ اس میں سب سے پہلے ’’معرفتِ حقیقت‘‘ کو رکھا گیا یعنی حقیقت کو جاننا‘ meditation‘ contemplation اور reality کو دیکھنا اور اس پر غور وفکر کرنا۔ دوسرے نمبر پر رکھا گیا: How to live a moral life?‘ یعنی مجھے ایک ethical being کیسے بننا ہے۔ اگر ہم اس کو مذہبی معنوں سے جوڑ لیں تو دین بھی ہم سے دو مطالبے کرتا ہے: ایمان اور عمل صالح۔ مجھے کچھ چیزیں ماننی ہیں جس کا تعلق میرے ذہن اور فکر سے ہے اور مجھے کچھ کرنا ہے۔ یہاں بھی سب سے پہلے حقیقت کی معرفت ہے اور اس کے بعد ایک اخلاقی وجود بننا ہے۔ تیسرے نمبر پر ارسطو نے کہا: techne‘ یعنی طاقت۔ اس میں artifacts بھی آ گئے اور اس کے اندر tools بھی۔ انسان کو دنیا میں رہنا ہے اور اپنے نفس کو برقرار رکھنا ہے تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ طاقت چاہیے۔ کچھ نہ کچھ ایسے ذرائع چاہئیں جس سے اس کی sustenance ہو سکے۔ اس لیے عام طور پر ہمارے ہاں ٹیکنالوجی کی بنیادی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ٹیکنالوجی

Applied Science کو کہتے ہیں‘ جس سے ایسا لگتا ہے کہ پہلے سائنس ہے اور پھر اس سے ٹیکنالوجی پھوٹتی ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اگر انسانیت کے اعتبار سے دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ ٹیکنالوجی پہلے ہے اور سائنس بعد میں۔ جیسے basic technology کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ basic technology‘ مثلاً fire یہ ایک ٹیکنالوجی ہے۔ دو پتھر رگڑے گئے یا ایک خاص قسم کے درخت کے دو پتوں کو جب آپس میں رگڑا گیا تو اس سے چنگاری پیدا ہوگئی۔ چنانچہ آگ انسان کے بنیادی وجود کی sustenance کے لیے‘ یعنی اس کی خوراک کے لیے اور پھر اس کو گرم رکھنے کے لیے ایک بنیادی ٹیکنالوجی ہے جو بالکل شروع میں سامنے آ گئی۔ پھر wheel ہے جس کو ہم پہیہ کہتے ہیں۔ اس کا معاملہ بھی کوئی ایسا نہیں تھا کہ اس کے پیچھے میں کوئی تھیوریٹکل یا نظریاتی سائنس تھی اور اس کی بنیاد پر پہیہ ایجاد کیا گیا۔ اسی طرح alphabets جس کو ہم writing کہتے ہیں‘ بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک ٹیکنالوجی ہے‘ کیونکہ ہمارا تصور یہ رہا ہے کہ انسانیت میں بہت عرصے تک oral tradition تھی جبکہ written tradition تو ایک خاص phase کے بعد آئی ہے۔

ان تمام مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ٹیکنالوجی ایک خاص معنوں میں سائنس سے پہلے ہے۔ اگر دینی لحاظ سے بات کریں تو یہ وہ چیز ہے جو بنیادی ضروریات پوری کرنے میں انسان کی مدد کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو طرح کی چیزیں رکھی ہیں۔ ایک طرح کی چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا تعارف مثبت طور پر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ’’فطرت‘‘ کا لفظ ہماری دینی اصطلاحات میں ایک مثبت لفظ ہے۔ اسی طریقے سے روح کا لفظ بھی اپنے اندر بڑائی اور عظمت کے معنی رکھتا ہے۔ قلب بھی مثبت معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح عقل ہے‘ ضمیر ہے جو اسی نوعیت کے مثبت traits ہیں۔ پھر انسان کے اندر نفسِ امارہ اور جبلتیں ہیں جن کو instincts کہا جاتا ہے۔ انسان کے اندر شہوت اور غضب ہے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے ایسا لگتا ہے کہ قلب‘ ضمیر‘ روح یا عقل اصل میں انسان کو اللہ تعالیٰ سے متعلق رہنے کے لیے دیے گئے ہیں اور یہ ان کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اس کے برعکس نفس امارہ اور جبلتیں ہمیں دنیا سے متعلق رکھنے کے لیے دی گئی ہیں۔ یعنی ہم میں بھوک کی جبلت ہے‘ جنس کی جبلت ہے‘ urge to dominate ہے۔ یہ ہمیں دُنیا سے متعلق رکھتی ہیں۔ اگر یہ جبلتیں ہمارے اندر نہ ہوتیں تو ہم شاید اپنے آپ کو sustain نہ کر پاتے اور اپنی نسلوں کو آگے نہ بڑھا پاتے۔ یوں دنیا یا تمدن کا سفر آگے نہ چل پاتا۔ لہٰذا یہ نفس کے تقاضوں کے لیے ہیں۔

روایتی طور پر‘ یعنی Modernity یا Enlightenment سے پہلے نفس کے حقوق پر focus تھا۔ نفس کے کچھ حقوق ہیں جو اللہ پاک نے انسان میں رکھے ہیں۔ ہماری دینی روایات بھی یہی کہتی ہیں کہ نفس کے ان حقوق کو ادا کرو۔ دنیا سے تمتّع کرو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یا حقوقِ نفس کی ادائی کے لیے جو ذرائع اور آلات و اوزار ہم نے استعمال کیے وہ اصل میں ٹیکنالوجی ہی تھی۔ البتہ دین یہ بھی کہتا ہے کہ دنیا سے تمہیں جو تمتع کرنا ہے اور نفس کے حقوق ادا کرنے ہیں تو یہ تمہاری اصل حقیقت کے تابع رہنے

چاہئیں اور تمہاری اصل حقیقت ربّ کی بندگی ہے۔ یعنی تمہیں دنیا میں ان چیزوں کو ایجاد اور دریافت کرنا ہے جو تمہاری بندگی کو facilitate کر سکیں، جو تمہاری بندگی کو آگے لے جا سکیں۔ گویا ٹیکنالوجی وہ techne ہے جو بندے کو حقوقِ نفس کی ادائی میں معاون ہو اور اسے زندگی بسر کرنے میں سہولت دے تاکہ وہ سکون سے بندگی کر سکے۔ یہ ٹیکنالوجی کے بارے میں روایتی اور کلاسیکل تصوّر تھا۔

ٹیکنالوجی کا جدید تصوّر

ٹیکنالوجی کی ماڈرن پراجیکشن نے، جسے Modernity بھی کہا جاتا ہے، ٹیکنالوجی کے تصوّر کو بالکل ہی بدل دیا ہے۔ پہلے اس نے انسان اور انسانیت کے تصوّر میں تبدیلی کی، جس کے نتیجے میں ٹیکنالوجی کا تصوّر بھی ازخود بدل گیا۔ Modernity کی سب سے بڑی قدر ہے: ہیومن فریڈم، ہیومن لبرٹی، human autonomy۔ یہ باتیں ہم خود سے نہیں بنا رہے بلکہ اس کی بنیاد Immanuel Kant کا ایک چھوٹا سا آرٹیکل ہے۔ جب بھی بات ہوتی ہے کہ روشن خیالی کسے کہتے ہیں، خِرد افروزی کسے کہتے ہیں، تحریکِ تنویر یا Enlightenment کسے کہتے ہیں تو کانٹ کے اسی مضمون کو بنیادی ماخذ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں کانٹ نے بتایا ہے کہ دراصل انسان نے اپنے اوپر ایک خود ساختہ ذہنی غلامی اور تقلید عائد کر رکھی ہے جسے وہ immaturity یا minority یعنی نابالغیت سے تعبیر کرتا ہے۔ نابالغیت یہ ہے کہ انسان اپنے غیر کی رہنمائی میں زندگی بسر کرتا ہے، خود سے رائے قائم نہیں کرتا۔ کہیں اس کا باپ ہے، کہیں اس کا استاد ہے، کہیں حاکم ہے اور کہیں مذہبی پیشوا ہے جو اس کو بتاتا ہے۔ کانٹ نے کہا کہ Enlightenment یہ ہے کہ انسان کے اوپر جو Self-incurred tutelage ہے اس سے وہ نکلے اور خود سے سوچے، خود سے سمجھے، خود سے جانے اور ہر چیز کو خود طے کرے۔ اسے وہ کہتا ہے: Sapere Aude یعنی dare to use your own reason or dare to understand۔

روایتی طور پر دنیا کے کسی بھی مذہب کا آدمی، چاہے وہ مذہب revealed ہو یا non-revealed، اصلاً Theonomous Being یعنی governed by God تھا۔ وہ ایک God-dependent being تھا۔ یہاں خدا کا تصوّر مختلف ہو سکتا ہے۔ کہیں پر وہ personal God ہے، کہیں پر آرڈر ہے، کہیں پر وہ abstraction ہے، کہیں پر وہ آئیڈیا ہے، لیکن بہرحال خدا کا تصوّر تھا۔ روایت میں انسان ایک ایسا وجود تھا جو اپنے وجود اور اپنی بقا میں خدا پر انحصار رکھتا تھا۔ اب ایک نیا آدمی پیدا ہوا جس کو کہا گیا کہ یہ Autonomous Being ہے، یعنی governed by itself ہے۔ یہ بالکل اپنے اوپر انحصار کر سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر سب سے بڑی قدر self-discrimination ہے۔ یعنی اپنے آپ کو خود سے تشکیل دینا، اپنے آپ کو خود سے بنانا، اپنے وجود اور شعور کی کنڈیشننگ خود سے کرنا کسی غیر کی مدد یا تحکم کے بغیر، خاص طور پر اس غیر کے بغیر جو Divine ہے۔ انسان as a person اور as a collectivity خود طے کر سکتا ہے کہ اس کو کیا ماننا ہے،

کیا کرنا ہے‘ اور کیا بننا ہے۔ انسان سے اوپر کوئی اور طاقت ایسی نہیں ہے جو اسے یہ باتیں dictate کرے۔ بہرحال یہ جدید آدمی کا اپنا بیانیہ ہے۔

پہلے ذکر ہوا کہ ٹیکنالوجی انسان کو اس کی ضروریات پوری کرنے میں معاون چیزوں کا نام ہے‘ تو جب انسان ہی بدل گیا تو اس کی ضروریات بھی بدل گئیں۔ جب اس کی ضروریات بدل گئیں تو ان کو پورا کرنے والے آلات اور ٹولز بھی بدل گئے‘ یعنی ٹیکنالوجی بھی بدل گئی۔ چنانچہ انسان کے تصوّر کی تبدیلی سے ٹیکنالوجی کے تصوّر میں از خود تبدیلی آ گئی۔ روایت میں انسان عبد تھا اور عبد کا تعلق techne سے یہ تھا کہ وہ نفس کے حقوق ادا کرنے میں چیزوں کو کیسے استعمال کرے۔ جب انسان کے تصوّر میں تبدیلی آئی تو بات حقوقِ نفس سے آگے چلی گئی۔ اب ٹیکنالوجی حقوقِ نفس کے بجائے حظوظِ نفس کو پورا کرنے بلکہ نفس کی لذّتوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کا نام ہے۔ یعنی اب دو پروجیکٹس ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے ایک تو human empancipation‘ human autonomy‘ ہیومن لبرٹی اینڈ فریڈم کو maximize کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کی جدید تعریف میں وہ بنیادی طور پر ایک pleasure-seeking animal ہے‘ اور ٹیکنالوجی کا ایک بڑا مقصد Hedonism ہے یعنی لذتوں میں غیر معمولی اضافہ کرتے چلے جانا۔ کچھ لوگوں نے ایک اصطلاح استعمال کی ہے: The Hedonistic Treadmill جس کے ذریعے آپ کا پورا طرزِ زیست ایک مخصوص ڈھب پر آ جاتا ہے اور آپ ساری زندگی دوڑتے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کی ضروریات satisfy ہو سکتی ہیں جبکہ desire (حرص‘ طمع) کا اختتام ایک اور desire ہوتی ہے۔ خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ رسول ﷺ نے فرمایا: جو آدمی حریص ہو جائے اس کے پاس اگر ایک سونے کی وادی بھری ہوئی ہو تو وہ کہے گا کہ دوسری مل جائے‘ دوسری مل جائے تو تیسری ہو۔ کبھی اس کو تسکین نہیں ہوتی۔ ایسے ہی آدمی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا پیٹ قبر کی مٹی سے ہی بھرتا ہے۔

روایتی اور جدید تصوّر میں تبدیلی کا سبب

ٹیکنالوجی کے روایتی اور جدید تصوّر میں یہ فرق کیسے آیا؟ کیا وجہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے اندر گزشتہ دو ڈھائی سو سال میں یہ غیر معمولی تبدیلیاں آئیں‘ اس سے پہلے کیوں نہیں آئیں؟ ماڈرن ٹیکنالوجی کی تاریخ اتنی لمبی نہیں ہے۔ آج سے تین ہزار سال پہلے کے آدمی اور آج سے تین سو سال پہلے کے آدمی میں کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں تھا۔ ڈارون کی تھیوری کہ بندر سے بتدریج انسان بن گیا‘ پھر اس تھیوری کی بنیاد پر یہ کہنا کہ شروع میں انسان بالکل وحشی تھا‘ غاروں میں رہتا تھا اور پتے کھاتا تھا‘ اس کو میں نہیں مانتا۔ اس تھیوری کو قرآنِ مجید کی تعلیمات کی روشنی میں تصوّرِ انسان کی بنیاد مانا ہی نہیں جا سکتا۔ قرآنِ مجید کی تعلیمات کے مطابق پہلا انسان پوری طرح مہذّب تھا اور یہ صرف انسان نہیں تھا بلکہ انسانِ کامل تھا۔ قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہر پیغمبر انسانِ کامل ہوتا ہے‘ اور سب سے پہلے انسان حضرتِ آدم علیہ السلام پیغمبر تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ وہ بالکل جنگلیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے‘ درست نہیں

ہے۔ فلسفہ پڑھاتے ہوئے ہم کبھی سوچتے ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں فلسفے کا ایک طالب علم ہوں اور فلسفہ پڑھاتا بھی ہوں۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ فلسفے کا آغاز Thales سے اور Ionia سے ہوا۔ لوگ جنگلی تھے' پھر انہوں نے سوچنا شروع کیا' وغیرہ وغیرہ۔ مذہب میں تو اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فلسفے کے بنیادی سوالات: ''مَیں کہاں سے آیا ہوں؟ کون ہوں؟ مجھے کدھر جانا ہے؟ میری حقیقت کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ اس کا مبدا کیا ہے؟ اس کا معاد کیا ہے؟ علم کسے کہتے ہیں؟ خیر اور شر کسے کہتے ہیں؟'' یہ سارے وجودی سوال ہیں۔ جس طرح یہ سوالات فلسفے کے ہیں اسی طرح مذہب کے بھی ہیں' اور مذہب ان سارے سوالات کا جواب دے چکا ہے۔ مذہب کی رُو سے پہلا آدمی پوری طرح ''ارتقا شدہ'' تھا اور وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے جو پیغمبر تھے' اور وہ لوگوں کو اللہ کی رہنمائی کی ہدایت دیتے تھے۔ چنانچہ یہاں ڈارون کی تھیوری کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مذہبی تاریخ کا جو انسانی تصوّر ہے' اس میں انسانیت کی کُل عمر کوئی چھ ہزار برس ہے۔ جدید سائنس ہمیں کائنات کے بارے میں تو اربوں کھربوں سال کی بات بتاتی ہے' البتہ انسانوں کے بارے میں جس کو وہ homo-sapien کہتی ہے' یہ کہتی ہے کہ اس کو لاکھوں سال ہو گئے۔ یہاں کیا یہ سوال نہیں اٹھتا کہ اگر لاکھوں سال لوگوں نے ایک خاص ڈھنگ سے گزارے تو کیا وجہ ہے کہ دو سو ڈھائی سو سال پہلے ایسی تبدیلیاں آئیں کہ ٹیکنالوجی نے ایک غیر معمولی ترقی کی؟ اصل بات یہ ہے کہ بنیادی تبدیلی تصوّرِ حقیقت' تصوّرِ انسان اور تصوّرِ کائنات میں آئی۔ درحقیقت انسان کے تین بڑے سوالات یہی تھے کہ: حقیقت/خدا کیا ہے؟' انسان کیا ہے؟' کائنات کیا ہے؟ اسی سے اس کا ورلڈ ویو متعین ہوتا ہے۔ پہلے ان سوالات کے بارے میں تصوّرات روایتی تھے۔ مثلاً خدا کیا ہے؟ وہ اس کائنات کا خالق ہے۔ حقیقت کیا ہے؟ یہ اصل میں روحانی ہوتی ہے۔ فلسفے کی بنیادی تعریف شروع سے یہ چلتی آ رہی ہے: love of wisdom۔ وِزڈم کا ایک مطلب تھا صورت سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جانا' اور دوسرا مطلب تھا کثرت سے گزر کر وحدت تک پہنچ جانا۔ حکمت اصل میں اسے کہتے تھے کہ انسان دنیا میں رہتا ہے جو عالَمِ کثرت ہے' یعنی عالَمِ صورت ہے' لیکن اس سے ماوراء ایک اور عالَم ہے جو عالَمِ حقیقت ہے۔

مذہب اور فلسفے کے بڑے بڑے سوالات اصل میں انسان کے بڑے سوالات تھے۔ انسانوں نے ہمیشہ سے تین چیزوں کو کھوجا ہے اور انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلی چیز: اس نے کوشش کی ہے وحدت تک پہنچنے کی اور یہ انسان کا ایک پُرانا آدرش ہے۔ دوسرے' انسان نے کوشش کی ہے ابدیت کے حصول کی۔ تیسرے' انسان نے کوشش کی ہے ماورائیت کی یعنی وہ اپنے اس وجود سے اوپر اُٹھ سکے' transcend کر سکے۔ آج سے تین چار سو سال پہلے تک ان تینوں چیزوں کو لوگوں نے جس locale میں locate کیا ہے وہ یہ دنیا نہیں بلکہ اس اس سے ماوراء ایک عالم ہے۔ فلسفے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیدائش یونان اور ایشیائے کوچک میں ہوئی۔ اس سے پہلے لوگ خرافات اور افسانوں کے تصوّرات کے تحت زندگی گزارتے تھے۔ اس دنیا میں جو کچھ

ہو رہا ہے وہ اس کا کھرا دیوتاؤں کے عالم میں ڈھونڈتے تھے کہ وہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کے مؤثرات ہم پر ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس دنیا کی جو واحد حقیقت ہے وہ یہاں سے باہر پائی جاتی ہے۔ جب فلسفہ وجود میں آیا تو سب سے پہلے فلسفی نے کہا کہ کائنات سے باہر نہیں، ہمیں اس دنیا کے اندر ہی اس کا مادّہ اور وحدت تلاش کرنی ہے۔ Thales جو پہلا فلسفی کہلاتا ہے، اس نے کہا کہ وہ مادّہ پانی ہے جبکہ Heraclitus نے کہا کہ وہ آگ ہے۔ فیثاغورث نے کہا کہ وہ ہندسہ ہے۔ کسی نے کہا کہ ہوا ہے، کسی نے کہا وہ Ether ہے، کسی نے کہا کہ وہ ایک ایسا مٹیریل ہے جو ناقابلِ تقسیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وحدت وہ بھی تلاش کر رہے تھے، اب جدید آدمی بھی اسے اس دنیا میں تلاش کر رہا ہے۔ پہلے وہ فلسفے کے ذریعے singularity کی تلاش میں تھے، اب وہ چاہ رہے ہیں کہ ٹیکنالوجی کے ذریعے اس تک پہنچ جائیں۔

دوسرے، انسان کی بہت بڑی آرزو ہے خلود حاصل کرنا۔ قرآنِ مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت میں تھے تو انہیں ابلیس نے اس راستے سے بہکایا: ﴿قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾﴾ (طٰہٰ) ''کہنے لگا: اے آدم! کیا میں تمہیں ایک ایسا درخت بتاؤں جس سے جاودانی زندگی اور وہ بادشاہی حاصل ہو جاتی ہے جو کبھی پرانی نہیں پڑتی؟'' اس کا مطلب ہے کہ انسان خلود، ابدیت چاہتا ہے۔ البتہ پہلے انسان یہ خیال کرتا تھا کہ خلود اس دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتا، یہ اس دنیا سے ماوراء ایک اور عالَم میں ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب میں جنت اور جہنم کا جو تصوّر ہے، اس میں بھی خلود ہے کیونکہ یہ انسان کی بڑی آرزو ہے۔

انسان کی تیسری آرزو اور خواہش ماورائیت یعنی اپنے وجود سے اوپر اٹھ جانا ہے۔ انسان کی خواہش رہی ہے کہ اپنے اس مادی وجود کو transcend کر جائے۔ اس کے لیے بھی ہمیشہ مذہب کی طرف دیکھا گیا۔ یہاں بھی ایک ماورائیت تو وہ ہے جو دنیا کے بعد جنت میں حاصل ہوگی کہ انسان اپنی جبلتوں اور بہت سی چیزوں کو ٹرانسینڈ کر جائے گا۔ ایک ماورائیت دنیا میں لوگوں نے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے انسان نے جس ڈسپلن کی طرف دیکھا اس کو روحانیات یا تصوف کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے بھی انسان اپنے آپ کو زمان و مکاں سے ماوراء کر دیتا ہے: ؎

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُناری نہ ہے زماں، نہ مکاں، لا الٰہ الا اللہ!

اور ایک شاعر نے کہا: ؎

عقل گوید شش جہت حد است و بیروں راہ نیست
عشق گوید ہست راہ و رفتہ ام من بارہا

''عقل نے کہا کہ شش جہت حد ہے اور اس سے باہر کوئی راستہ نہیں ہے، جبکہ عشق نے کہا کہ راستہ موجود ہے اور میں کئی بار اس راستے سے گزرا ہوں۔''

یعنی عقل نے کہا کہ یہ جو شش جہات ہیں (آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں بائیں) بس یہ انسان کی حدود ہیں، اس سے

باہر جانے کی کوئی راہ نہیں ہے' جبکہ عشق نے کہا کہ راہ ہے اور میں کئی مرتبہ اس راستے سے جا بھی چکا ہوں' یعنی ان جہات سے باہر تک میری رسائی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ ایک روحانی سفر ہوتا ہے۔ ہمارے صوفیاء کے ہاں سیرِ افلاک بھی ہے' اسی طرح سیر الی اللہ اور اس کے مراحل ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی اس ماورائیت کے لیے مادے یا دنیا کی طرف نہیں دیکھا۔ البتہ اب جدید دور میں وحدت کو' خلود کو اور ماورائیت کو بھی ٹیکنالوجی میں دیکھا اور کھوجا جا رہا ہے۔ ایک صاحب بہت مشہور ہیں' ٹیکنالوجسٹ بھی ہیں اور گوگل وغیرہ میں بہت اعلیٰ عہدوں پر رہے ہیں' ان کا نام ہے Raymond Kurzweil۔ ان کی کچھ کتابوں کے نام یہ بتانے کے لیے لینا چاہتا ہوں کہ ماڈرن ٹیکنالوجی کے آدرش کیا ہیں۔ ان صاحب کی ایک کتاب کا نام ہے: The Age of Intelligent Machines' یعنی جو انسان کی انٹیلی جنس کا تصور تھا' ان کا کہنا ہے کہ وہ ہم مشین کے اندر پیدا کر دیں گے۔ ایک اور کتاب ہے: The Age of Spiritual Machines۔ وہ جو ایک خیال تھا کہ انسان کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کے اندر ایک روح ہے' ایک ڈیوائن سپارک ہے' یہ صاحب کہہ رہے ہیں کہ مشین کے اندر بھی ہم یہ وصف پیدا کر دیں گے۔ پھر ایک کتاب کا نام ہے: Live Long Enough to Live Forever: Fantastic Voyage۔ یہ کتاب ۲۰۰۴ء میں آئی' اس میں انہوں نے ایک تھیوری پیش کی تھی کہ اگر آپ ۲۰۴۵ء تک اپنے آپ کو زندہ رکھ سکے تو اس کے بعد آپ اَمر ہو جائیں گے' آپ کو موت نہیں آئے گی۔ اس کے لیے دو طرح کی ٹیکنالوجیز پر کام ہو رہا ہے: ایک Bio Tech ہے اور ایک Info Tech ہے۔ بائیوٹیک سے ہم جسم کو Stem Cell کے ذریعے کلون کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ پھر جو سب سے بڑا اور پرانا مسئلہ ہے' جو فلسفے کا بھی سب سے بڑا اور پرانا مسئلہ ہے' جسے Problem of Consciousness کہا جاتا ہے یعنی انسان کی identity کیا ہے' تو کہا گیا کہ شعور کو بھی ہم انفوٹیک کے ذریعے ایک مشین میں اَپ لوڈ کر دیں گے۔ جب آپ کا کلون تیار ہو جائے گا تو پھر وہ ڈیٹا وہاں سے ڈاؤن لوڈ کر دیں گے اور آپ کو ایک وجود دیا جائے گا جو ہمیشہ رہے گا' کبھی ختم نہیں ہوگا۔ پھر ایک کتاب کا نام ہے: Transcend: Nine steps to Living Well Forever یعنی جسم سے اوپر اُٹھ جانا یا دُنیا سے اوپر اٹھ جانا۔ پھر اس کی ایک اور کتاب ہے: The Singularity is Near۔

جو تین باتیں مَیں نے بتائی تھیں' ایک ہی آدمی کی کتابوں کے ٹائٹلز میں وہ تصورات موجود ہیں۔ جدید آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے آپ کو maximize کرتے چلے جانا ہے جبکہ آزادی کا مطلب ہر طرح کی رکاوٹوں کو دُور کرنا ہے۔ ماڈرن فریڈم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ content less چیز ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ آپ کو کیا چاہنا چاہیے' بس یہ ہے کہ جو کچھ بھی مَیں چاہنا چاہوں اس چاہت کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ان کے لیے یہ اہم نہیں ہے کہ آپ کیا چاہتے ہیں' بلکہ اہم یہ ہے کہ جو بھی آپ چاہنا چاہتے ہیں وہ چاہ سکیں۔ اس راستے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہمیشہ سے رہی ہے وہ فزیکل رہی ہے' میٹریل رہی ہے۔ اس طبیعی اور مادی رکاوٹ کو ختم کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کا ڈول ڈالا گیا۔ رکاوٹ سے یہ مراد ہے کہ جیسے انسان ایک خاص فاصلے

سے آگے نہیں دیکھ سکتا' ایک خاص دُوری سے زیادہ سن نہیں سکتا۔ زمین پر اچھلتا ہے تو اس کو نیچے آنا ہوتا ہے' اوپر ہی اوپر نہیں جا سکتا۔ ان حدود کو ٹیکنالوجی کے ذریعے ختم کرنا ہے۔ البتہ انسان کے اوپر جو سب سے بڑی فزیکل رکاوٹ لگی ہوئی ہے' وہ موت ہے۔ اب اصل میں یہی پروجیکٹ ہے' جس پر کام ہو رہا ہے۔ یعنی ایک تو longevity ہے کہ زندگی کو بڑھاتے چلے جانا' کیونکہ اصل میں اور کوئی عالَم تو ان کے نزدیک ہے ہی نہیں' تو اس کا نتیجہ اسی زندگی کو بڑھاتے چلے جانا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ جیا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک ناکافی کوشش ہے' اس لیے اصل مسئلہ ان کا خلود حاصل کرنا ہے۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا تھا کہ انسان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کر سکتا ہے اور تاریخ میں ایسے لوگ رہے ہیں جنہوں نے اس طرح کا اعلان کیا ہے' لیکن جدید آدمی گویا اجتماعی طور پر یہ اعلان کرنے جا رہا ہے۔ Yuval Noah Harari ایک بہت مشہور اسرائیلی تاریخ دان اور مصنف ہے۔ اس کی کتابیں آج کل فیشن میں ہیں۔ ہر دور میں کوئی ایک آدھ نام ہوتا ہے جس کی مالا ہمارے یہاں کے ملحدین جپتے رہتے ہیں' تو آج کل ہراری ان کی زبانوں پر ہے۔ پچھلی صدی کا دوسرا نصف برٹرنڈ رسل کے نام پر گزر گیا' اس سے قبل کارل مارکس تھا۔ ۲۰۰۰ء کے بعد یہ جگہ رچرڈ ڈاکنز کو مل گئی۔ اب کوئی پانچ چھ سال ہوئے ہیں کہ یہ ہراری آ گیا ہے اور ہر جگہ اسی کی شہرت ہے۔ اس نے ارتقا کے ڈسکورس پر مبنی پوری انسانیت کی تاریخ لکھ دی ہے۔ اس نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر Sapiens کے نام سے ایک تاریخ لکھ دی۔ اسی طرح ایک کتاب Human of the Future کے نام سے بھی لکھی۔ اسی طرح ایک کتاب کا ٹائٹل ہے Homo Deus یعنی Man god۔ خدا تو چونکہ کوئی ہے نہیں' نطشے نے بھی اعلان کر دیا تھا معاذ اللہ کہ God is dead' خدا مر گیا ہے۔ اب یہ کہا جانے لگا کہ خدا تو چونکہ ہے ہی نہیں تو ہم سب کو اپنی ذات میں چھوٹا موٹا خدا بننا ہے۔ اسی لیے ماڈرن ٹیکنالوجی کا ایک سافٹ ٹارگٹ ہے اور ایک ہارڈ ٹارگٹ ہے۔ سافٹ ٹارگٹ ہے لذت کو بڑھاتے چلے جانا' انسانی آزادی کو بڑھاتے چلے جانا جبکہ اس کا ہارڈ ٹارگٹ ہے خدا بننے کا عمل' خدا سے بغاوت بلکہ خدا بننے کی ایک چاہت۔

اب تک جو معروضات پیش کی گئیں وہ یہ کہ ہم کیا ہیں! دوسرا مَیں نے یہ کہا تھا کہ روایتی طور پر ٹیکنالوجی کے کیا مقاصد بیان کیے جاتے تھے! یہاں سب سے اوپر معرفتِ حقیقت ہے' اس کے بعد ایک اخلاقی وجود بننا' پھر یہ انسان طاقت حاصل کرے۔ افلاطون کے ہاں بھی یہ تینوں چیزیں ملتی ہیں۔ اس نے کہا کہ انسان میں تین طرح کی چیزیں ہیں: ایک reason' ایک will اور ایک appetite ہے۔ reason کا تعلق حقیقت سے ہے' will کا تعلق کچھ کرنے اور بننے سے جبکہ appetite جس کو ہم شہوتیں کہتے ہیں' اس کا تعلق پاور سے ہے جو انسان نے حاصل کرنی ہے۔

اب تھوڑی سی بات اس پر کرتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ایک فرق لوگ بیان کرتے تھے کہ پہلے انسان کا تعارف تھا کہ یہ Homo-Depicter ہے' یعنی دنیا کو بیان کرتا ہے کہ یہ کیا ہے۔ یہ پروجیکٹ گویا

سائنس کے پاس تھا۔ انسان کا ایک اور تعارف تھا کہ وہ Homo-Faber ہے' Tool maker ہے کہ وہ چیزوں کو بناتا ہے' جس کو ہم نے کہا کہ وہ techne کے ذریعے بناتا ہے۔ یہ دو چیزیں گویا ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ البتہ ایک چیز اس سے بھی اوپر تھی: Homo-Sapien یعنی man the wise اوپر ہے۔ اس کے بعد دنیا کو جاننا یہ Depicter جبکہ اس کو اپنے مصرف میں لانا' اپنے کام میں لانا Homo-Faber ہے۔ ماڈرن ٹیکنالوجی میں ایسا لگتا ہے کہ Homo-Depicter اور Homo-Faber آپس میں مل گئے ہیں' اس لیے اب pure science اس طریقے سے نہیں پائی جاتی۔ پہلے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ pure science میں سائنس دان کا عمل meditative قسم کا ہوتا ہے یعنی جس طریقے سے ایک صوفی اپنی خانقاہ میں ہوتا ہے ویسا ہی عمل ایک سائنس دان کا اپنی لیبارٹری میں ہوتا ہے۔ اب آہستہ آہستہ pure science ختم ہوتی چلی جارہی ہے' جیسا کہ فلسفے میں بھی Pure Philosophy' جو میٹا فزکس تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہے اور مغرب میں فلسفہ اب Applied Form میں زیادہ ہے۔ Linguistic philosophy یا Biomedical ethics یا Business ethics یا Media ethics ہے جبکہ Pure philosophy ختم ہوتی جارہی ہے۔ اب سائنس کے شعبے میں ہمارے بہت سے دوست جب باہر جانے کی کوشش کرتے ہیں اور ریاضی یا فزکس میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے مشکل ہوتی ہے۔ ان کو فنڈنگ نہیں ملتی' کوئی endowments نہیں ملتیں۔ ایسے کوئی پروگرامز نہیں ہیں جن کے ذریعے وہ پی ایچ ڈی کرسکیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ٹیکنو سائنس دریافت کا کوئی سادہ عمل نہیں بلکہ کیپٹل ازم کا ایک بہت بڑا آلہ ہے۔ کیپٹل ازم ایک پوری ایمپائر ہے اور ٹیکنو سائنس اس کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کیا وجہ ہے کہ ہمارا ملک سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے نہیں جارہا' حالانکہ فلاں بچے نے فلاں چیز ایجاد کرلی! دراصل ایجاد کرنا کوئی مسئلہ نہیں' مسئلہ تو actualize کرکے mass scale پر بنانا ہے۔ اس کے لیے جو labs چاہئیں' جو انفراسٹرکچر چاہیے' اس پر اربوں ڈالر خرچ آتا ہے' وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب سائنس کا عمل کوئی خالص ذہنی عمل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ سرمائے کا ایک غیر معمولی بیک اَپ ہوگا تو یہ بات پھر آگے بڑھے گی' ورنہ نہیں۔

ماڈرن ٹیکنالوجی کیا ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ ماڈرن ٹیکنالوجی کے بارے میں کسی نے یہ بات کہی:

(1) Technology is ontology of our age

(2) Technology is ecology

(3) Technology is ideology

یہ عرض کیا گیا تھا کہ فلسفے میں انسان کے تقریباً تین بڑے سوالات سمجھے جاتے ہیں: وجود کیا ہے؟ شعور یا علم کیا ہے؟ قدر کسے کہتے ہیں؟ فلسفے کی اصطلاح میں Ontology کو علم الوجود' Epistemology کو علم العلم اور

Axiology کو علم الاقدار کہتے ہیں۔ علم الاقدار کی دو شاخیں ہیں: Ethics (اخلاقیات) اور Aesthetics (جمالیات)۔ ہر دور میں یہ سوال بہت زیادہ اہم تھا کہ سب سے بڑا وجود کیا ہے! یونان میں جو ابتدائی فلسفی آئے انہوں نے Cosmology یعنی کائنات کو موضوع بنایا۔ بعد کے فلسفیوں میں علم الانسان یا علم نفسیات پر توجہ مرکوز رہی۔ پھر قرونِ وسطیٰ کا دور آیا' جو کرسچن عہد تھا۔ وہاں کی Ontology علمِ الٰہیات قرار پائی۔ ہر چیز پر Theology کا غلبہ ہو گیا اور لوگوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ Philosophy became the handmaiden of Theology یعنی اصل فلسفہ تو ختم ہی ہو گیا' بلکہ الٰہیات کی لونڈی بن کر رہ گیا۔ پھر جدیدیت نے آ کر دوبارہ انسان کو توجہ کا مرکز بنا دیا' لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد وہ پس منظر میں چلا گیا اور کائنات نے اہمیت حاصل کر لی۔ اسی لیے Walker Percy نے کتاب لکھی تھی: Lost in the Cosmos۔ جب انسان کو de Divinize کر دیا گیا اور اس کے اندر کسی روح کی موجودگی کا انکار کر دیا گیا تو پھر انسان محض ایک مادہ اور حیوان قرار پایا۔ اگر انسان ایک مادّہ اور حیوان ہے اور اسی پر تحقیق ہونی ہے تو پھر کائنات انسان سے بڑی ہے۔ اس لیے مغرب کے بہت سے بڑے بڑے فلسفی یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جو آپ انسان کی عظمت اور شرف کی باتیں کر رہے ہیں' ایک طرف آپ Darwinian evolution کو مانتے ہیں اور دوسری طرف Human dignity کی بات کرتے ہیں جو کہ مضحکہ خیز ہے۔ John Gray ایک بہت بڑا برطانوی فلسفی ہے۔ اس کی کئی کتابیں ہیں۔ Straw Dogs میں اس نے یہی لکھا ہے کہ یہ سارا تصور ایک فریب ہے' جو روشن خیالی اور جدیدیت نے بنیادی طور پر عیسائیت سے چوری کیا ہے۔ ایک کتاب کا نام ہے Stealing from God' یعنی بہت سے جدید فلسفیانہ افکار یا Enlightenment values اصل میں مذہب سے چوری کی گئیں اور ان کے اوپر انہوں نے سیکولر لیبل لگا دیے۔

شرفِ انسانیت کا سبب تو انجیل کی نص سے ثابت تھا کہ God created Adam in his own image' خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ پھر اس کے اندر اپنی روح میں سے پھونکا' فرشتوں کو اس کے آگے جھکایا۔ اگر آپ اس نکتے کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ انسان حیوان ہی کی ایک ارتقا شدہ شکل ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے شرف کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ فرائڈ نے کہا تھا کہ شرفِ انسانیت کو دو بڑے دھچکے لگے۔ پہلے Copernicus نے کہا کہ زمین مرکزِ کائنات نہیں ہے بلکہ یہ تو خود حرکت میں ہے اور سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ پہلے ایک Geocentric تناظر تھا اور زمین کو مرکز کی حیثیت حاصل تھی' پھر تناظر Heliocentric ہو گیا اور سورج مرکزِ کائنات قرار پایا' تو انسان کی عظمت کو کچھ تھوڑا سا دھچکا لگا۔ البتہ اتنا بہرحال رہا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور ایک الگ ممتاز مخلوق ہے۔ انسان کی عظمت کو دوسرا دھچکا ڈارون نے لگایا۔ اس نے بتایا کہ انسان کوئی الگ سے مخلوق نہیں ہے' اس کا کوئی روحانی پہلو نہیں ہے۔ یہ تو بس ایک جانور ہی ہے' البتہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس کا دماغ زیادہ پختہ ہے اس لیے وہ زیادہ غور و فکر کے معاملات کر سکتا ہے۔ فرائڈ جو یہ سب کہتا

ہے‘اس نے تیسرے دھچکے کا ذکر نہیں کیا۔ دراصل اسی نے آ کر انسانیت کو تیسرا دھچکا لگایا۔ اب تک تو یہ بات تھی کہ انسان حیوان تو ہے لیکن یہ حیوان ایک شعور رکھتا ہے جبکہ جانور تو بس جبلتوں کی بنیاد پر زندگی گزارتے ہیں۔ انسان کے اندر consciousness ہے‘ شعور ہے اور اس شعور کے مطابق وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ فرائڈ نے بتایا کہ انسان کا conscious mind اس کی زندگی کو govern نہیں کرتا بلکہ اس کا تحت الشعور یا لاشعور اسے dictate کرتا ہے۔ انسان تو بنیادی طور پر حیوان ہے‘ جو بیمار بھی ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک جنسی حیوان ہے اور جب اس کے جنسی جذبے پر قدغنیں لگائی جاتی ہیں تو پھر وہ کبھی مذہب کی طرف‘ کبھی روحانیت کی طرف‘ کبھی اخلاق کی طرف‘ کبھی جمالیات کی طرف جاتا ہے۔ چوتھا دھچکا تب لگا جب Alan Turing نے ایک مشین لرننگ کا تصور دیا اور کہا کہ اب ہم بنیادی طور پر انسان کو مشین کے ماڈل پر ڈھالیں گے۔ اسی لیے اب جو ماڈل پیش کیا جا رہا ہے وہ Cyborg کا ہے‘ جس کا مطلب ہے half human and half machine۔ یعنی اب انسان کے لیے زیادہ تر analogies جو استعمال کی جا رہی ہیں وہ حیوان کی نہیں بلکہ مشین کی ہیں۔ غور کیجیے کہ تصورِ انسان کہاں سے کہاں تک آ گیا۔ تو یہ ہے وہ بات کہ Technology is ontology of our age۔

دوسری بات جو عرض کی گئی کہ Technology is Ecology تو ٹیکنالوجی محض ایک ایجاد نہیں ہے بلکہ جو نئی ٹیکنالوجی آتی ہے اس کے ذریعے انسان اور اس سے سارا ماحول بدل جاتا ہے۔ انسان کے تعلقات چار طرح کے ہیں: انسان کا اپنے خدا سے تعلق‘ انسان کا اپنے نفس سے تعلق‘ انسان کا انسانوں سے تعلق‘ اور انسان کا کائنات سے تعلق۔ ماڈرن ٹیکنالوجی کی ہر ایجاد نے انسان کے ان سارے تعلقات کو بدل دیا۔ Marshall McLuhan نے کہا تھا کہ پرنٹنگ پریس نے غیر معمولی تبدیلی پیدا کی۔ پھر مشین کی ایجاد نے انسانوں کو بہت تبدیل کیا۔ روشن خیالی اور جدیدیت میں ہسٹری آف آئیڈیاز ہی کو موضوع بنایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بنیادی طور پر مغرب میں کچھ نظریات پیش کیے گئے اور پھر وہ پوری دنیا میں پھیل گئے‘ مثلاً Tolerance‘ پراگرس‘ Equality‘ فریڈم وغیرہ۔ Richard M Weaver کی کتاب ہے: Ideas have Consequences۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ technology is ecology تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی بالکل ایک نیا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ ہر چیز بدل جاتی ہے حتیٰ کہ انسان بھی اندر اور باہر سے یکسر بدل جاتا ہے۔

تیسرا جملہ میں نے کہا تھا کہ Technology is ideology تو بات واضح ہے کہ ٹیکنالوجی ویلیو نیوٹرل نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں عام طور پر خیال یہ ہے کہ ٹیکنالوجی محض ایک آلہ ہے اور جو لوگ اسے استعمال کرتے ہیں‘ وہ جس مقصد کے لیے استعمال کریں گے ویسا ہی انہیں نتیجہ مل جائے گا۔ مثال دی جاتی ہے تلوار کی کہ یہ ایک مجاہد کے ہاتھ میں ہو تو قتال فی سبیل اللہ کے لیے‘ ظلم کے خاتمے کے لیے‘ عدل کے قیام کے لیے ہوتی ہے اور وہی تلوار اگر ایک بلوائی کے ہاتھ میں ہو تو اس سے فساد برپا ہوتا ہے۔ بہت سادگی سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ماڈرن ٹیکنالوجی بھی ویلیو نیوٹرل ہوتی ہے۔ وہ ایک خالی vessel کی طرح ہے‘ آپ اس میں جو بھی چیز ڈال دیں وہ شکل اختیار

کر لیتی ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے' کیونکہ میں نے عرض کیا ہے کہ اس ٹیکنالوجی کے اثر سے انسان کا حقیقت کے بارے میں تصور بدل گیا' اپنے بارے میں تصور بدل گیا۔ انسان ایک مادی وجود ہے۔ لذت کے حصول کی کوشش میں لگا رہنے والا حیوان ہے۔ انسان کا کائنات کے بارے میں بھی تصور بدل گیا ہے۔ اس سے پہلے کائنات کا مصرف یہ تھا کہ یہ اللہ کی نشانیوں کا مجموعہ ہے' اور نمبر دو یہ نفس کے حقوق کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس کائنات کے ساتھ ہمارے دو طرح کے تعلقات مطلوب تھے۔ ایک یہ کہ کائنات اللہ کی مذکِر بنے' اللہ کی یاد دہانی کرائے' اللہ کی آیات کا مجموعہ بنے۔ دوسرا یہ کہ کائنات اللہ کی نعمتوں کا محل بنے کہ انہیں ہم حاصل کریں اور ہمارے اندر شکر گزاری پیدا ہو۔ اس لیے یہ عرض کیا گیا تھا کہ روایتی آدمی ٹیکنالوجی میں کیوں آگے نہیں بڑھا' اس نے دنیا کی لذتوں کو بڑھانے کا پروجیکٹ کیوں اختیار نہیں کیا! سبب یہ ہے کہ وہ ایک مختلف انسان تھا' اس انسان سے جو سترھویں اور اٹھارویں صدی میں پیدا ہوا۔ اسی لیے ہمارے ہاں لوگ ہیومن رائٹس کی باتیں کرتے ہیں اور پھر ہم اس کو تلاش بھی کرنے لگتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ نے تو ۱۹۴۰ء میں انسانی حقوق کا چارٹر پیش کیا جبکہ انسانی حقوق کا سب سے بڑا چارٹر تو خطبہ حجۃ الوداع میں ہے۔ Michel Foucault کہتا ہے کہ humanity is a recent invention۔ یہ جو ماڈرن ہیومن ہے یہ اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا ہے' اس سے پہلے کا انسان وہ انسان نہیں تھا جو اب پیدا ہوا ہے۔ اس کا کائنات سے تعلق ہی بدل گیا۔ فرانسس بیکن نے یہ dictum دیا کہ Knowledge is Power۔ پاور کوئی اخلاقی یا روحانی چیز نہیں ہے۔ Michel Foucault نے اس پورے سرکل کو مکمل کر دیا کہ knowledge is sheer violence' یعنی پاور کا مطلب ہے لوگوں کو نقصان پہنچانے کی صلاحیت' لوگوں کو لوٹنے کھسوٹنے کی صلاحیت' لوگوں کا استحصال کرنے کی صلاحیت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید آدمی کا نیچر کے ساتھ تعلق بالکل مختلف ہے۔ وہ اس کائنات کی ہر چیز کو اس زاویے سے دیکھتا ہے کہ یہ ایک ذریعہ ہے جو میرا منتظر ہے کہ میں کیسے اسے دریافت کروں' ذاتی مفاد میں صرف کر دوں اور اپنے مصرف میں لے کر آؤں! روایتی آدمی نے نیچر کو کبھی اس طرح نہیں دیکھا۔ اسی لیے یہ بھی کہا گیا کہ جدید ٹیکنالوجی کا تعلق سائنس سے زیادہ میجک کے ساتھ ہے۔ جادو میں اشیا میں تحول ہو جاتا ہے' حقیقت کو اپنے موافق ڈھال لیا جاتا ہے' اور یہی آج ہو رہا ہے۔

مغرب کی نمائندہ اقدار اور ٹیکنالوجی

اب ہم مختصراً یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغرب میں جن چیزوں کو اقدار سمجھا جاتا تھا' ان کو ٹیکنالوجی نے کیسے متاثر کیا۔ اہلِ مغرب کی سب سے بڑی قدر freedom یا آزادی تھی' جو تمام اقدار سے بڑھ کر تھی' لیکن اب ان کے بڑے لوگوں کو یہ لگ رہا ہے کہ ماڈرن ٹیکنالوجی نے ہماری آزادی سلب کر لی۔ اس میں ایک پہلو تو surveillance کا ہے۔ اتنی زیادہ جاسوسی اور نگرانی ہے کہ ریاست ہمیں اندر اور باہر سے دیکھ رہی ہے' اور اس جاسوسی میں مارکیٹ کی مدد شامل ہوتی ہے۔ سٹیٹ اور مارکیٹ کا آپس میں گٹھ جوڑ ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعے

جو ٹیکنالوجی وجود میں آتی ہے اس میں ہر چیز گویا ریاست کی مرضی کے موافق ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ human autonomy پر جس طرح ٹیکنالوجی نے جبر کیا ہے' وہ ناقابلِ بیان ہے۔ اب تصوّر یہ ہے کہ جو چیز ایجاد کی جاسکتی ہے وہ ایجاد کرنی ضروری ہے' حالانکہ پرانے لوگوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ بہت سی چیزیں ان کے سامنے آتی رہیں مگر انہوں نے اسے مشغلہ نہیں بنایا۔ تصوّر یہ تھا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے' اس میں ہماری آخرت کے لیے فائدہ نہیں ہے۔ آزادی کو ٹیکنالوجی نے سلب کیا اور ایسا نہایت سفاکی کے ساتھ کیا۔ پہلے کہتے تھے کہ Big brother is watching you' اب کہتے ہیں کہ Big data is watching you چنانچہ اب ڈیٹا ڈکٹیٹر شپ کا دور جاری وساری ہے۔

دوسری بڑی قدر اہلِ مغرب کے یہاں Equality یا مساوات تھی' لیکن اب یہ ہے کہ جس کے پاس پیسہ ہے وہ ٹیکنالوجی کو استعمال کر کے اپنی قوت' صلاحیت اور اپنے تصرفات میں بہت اضافہ کر سکتا ہے اور ایک برتر حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔ البتہ یہ بہت تھوڑے سے ہوں گے اور باقی انسانیت ساری کی ساری اچھوت اور نچلے درجے کی ہو جائے گی۔ C.S.Lewis نے یہ بات ۱۹۳۰ء میں کہی تھی۔ اس نے اپنی کتاب The Abolition of Man میں لکھا ہے کہ فطرت یا نیچر کو مسخر کرنے کا پروجیکٹ بنیادی طور پر فطرت کی تسخیر نہیں ہے بلکہ Conquering of humanity by some people ہے۔ یعنی فطرت کو چند لوگ دریافت کر رہے ہیں' انسانوں پر بھی وہی کنٹرول رکھتے ہیں اور یہی لوگ conditioners of the world ہوں گے۔ یہ لوگوں کو کنڈیشن کریں گے اور باقی سب ان کے محتاج ہو جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برابری کا خواب بھی ختم ہو رہا ہے۔

ایک اور قدر humanity یا humanism یعنی انسانیت تھی۔ آج یہ کہا جا رہا ہے کہ مشین انسانوں سے زیادہ ذہین اور طاقتور ہو چکی ہے۔ مشینوں کے ذریعے لذت کا حصول زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں انسان کہاں گیا؟ وہ تو غائب ہو گیا۔

اس کے بعد ایک بہت بڑی قدر happiness یعنی خوشی اور سرور تھا۔ اس کو انہوں نے بت بنایا' لیکن اب ان کو یہ لگ رہا ہے کہ ٹیکنالوجی ہمیں بیگانگی کی طرف دھکیل رہی ہے' اور ڈپریس کر رہی ہے۔ اس پر تو بہت سی سٹڈیز آ چکی ہیں کہ جو لوگ جتنا زیادہ سوشل میڈیا استعمال کرتے ہیں وہ اتنا اداس رہتے ہیں اور ڈپریس ہوتے ہیں۔ بظاہر لگتا ہے کہ اس نے ہمیں لوگوں سے جوڑ دیا ہے لیکن حقیقت میں اس نے ہمیں بہت تنہا کر دیا ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ فیس بک پر یا مختلف چینلز پر کسی کے پانچ سو فرینڈز ہیں' لیکن گوشت پوست کا دوست ایک بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایک جعلی تعلق ہے' قربت نہیں ہے۔ کمیونٹی وہ ہوتی ہے جس کے ساتھ آپ کا فزیکل تعلق ہو۔

اہلِ مغرب کا ایک اور خواب جمہوریت تھا' لیکن اب اس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ حکومت جتنی زیادہ totalitarian ہو گی اور جتنا آمرانہ برتاؤ کرے گی اتنا ہی وہ مضبوط ہو گی۔ تو پھر جمہوریت کیا ہوئی!

اس کے بعد پراگرس کا آئیڈیا تھا‘ اور ایک Utopian View تھا کہ ہم دنیا کو جنت بنا دیں گے‘ لیکن اب ہم دیکھتے ہیں ستر‘ اسّی سال سے جو لٹریچر چھپ رہا ہے وہ Dystopian ہے‘ یعنی ادبیات میں ایسا دکھایا جاتا ہے کہ گویا ٹیکنالوجی دنیا کو جہنم بنا دے گی۔

پھر اسی طرح ایک تصوّر Post human کا بھی ہے کہ اب انسانیت Trans humanism کی طرف جا رہی ہے۔ گویا انسانیت اپنی موجودہ جسمانی و ذہنی حدود توڑ کر اوپر اٹھ رہی ہے۔

یہ ساری باتیں وہ ہیں جن کو مغرب والے خود بتا رہے ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ جب بھی ٹیکنالوجی پر بات ہوتی ہے‘ تو زیادہ تر یہی دیکھا جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی ہمارے لیے کیا کچھ کر رہی ہے۔ جب بھی ہم اس پر غور کریں گے تو ٹیکنالوجی کو appreciate ہی کریں گے اور اس کے فضائل ہی بیان کریں گے۔ لیکن ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ ٹیکنالوجی ہمارے ساتھ کیا کچھ کر رہی ہے! اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ہم اس پر بھی غور کریں۔ کسی آرام دہ ٹھنڈے کمرے میں بیٹھے ہوں‘ لائٹیں جل رہی ہوں‘ سہولت میسر ہو تو یہی لگتا ہے کہ ٹیکنالوجی ہمیں بہت کچھ ڈیلیور کر رہی ہے۔ ایسے میں ہم سب اس کے شکر گزار ہوتے ہیں لیکن ٹیکنالوجی ہمارے ساتھ جو کچھ کر رہی ہے اور ہمیں جس طرح بدل رہی ہے اس کا شعور شاید ہمیں نہیں ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ اس پہلو کو بھی problematize کیا جانا چاہیے اور اس پر بھی گفتگو ہونی چاہیے۔

ٹیکنالوجی کے بارے میں بندۂ مومن کا نقطۂ نظر

اب تک ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ ٹیکنالوجی کو اہلِ مغرب کس طرح دیکھتے ہیں۔ اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمیں ٹیکنالوجی کے بارے میں کیا تصوّر رکھنا چاہیے۔ ہماری بنیادی پہچان یہ ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں‘ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف یکسو رہنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک بدّو حاضر ہوا اور عرض کی کہ: اے اللہ کے رسول ﷺ! اسلام کے قوانین مجھ پر زیادہ ہو گئے ہیں۔ میں ایک دیہاتی سا آدمی ہوں‘ کہاں اتنی باتیں یاد رکھوں گا۔ آپ مجھے کوئی ایسی مختصر بات بتا دیجیے جس سے میں چمٹ جاؤں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا یَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰہِ تعالیٰ)) (رواہ الترمذی) ”تمہاری زبان برابر اللہ کی یاد سے تر رہے۔“ ہمارا دین ہم سے بہت کچھ تقاضا کرتا ہے جن کا حاصل یہ ہے کہ ہم اللہ سے غافل نہ ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم اس دنیا کو ”دار الغرور“ یعنی دھوکے کا گھر نہ بننے دیں۔ ہم اس وقت Technologically Mediated World میں رہتے ہیں۔ اس دنیا کے اندر دار الغرور بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا﴾ (الکہف:۷) ”اس زمین پر جو کچھ ہے‘ ہم نے اس کو زمین کے لیے زینت بنایا۔“ لیکن Technologically Mediated World Life میں تو بہت زیادہ ہی اس کا رنگ آ گیا اور تعیش بہت زیادہ ہو گیا۔ لہٰذا اب ہم سے تقاضا یہ ہے کہ ہم اس دنیا کو دھوکے کا گھر نہ بننے دیں۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۥ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ

الْغَرُوْرُ ۝۵﴾ (فاطر) ''دیکھنا کہیں دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں مبتلا نہ کرے‘ اور سب سے بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ (کی بندگی) کے بارے دھوکے میں نہ ڈال دے۔''

ٹیکنالوجی کا اصل ہدف: تین چیزیں

تین چیزیں ہمارے لیے بہت بڑی متاع ہیں: وقت‘ توجّہ اور کشش۔ ماڈرن ٹیکنالوجی نے ان تینوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ دن کا کتنا بڑا حصّہ اس ٹیکنالوجی کو بنانے اور اس کے استعمال میں کھپ جاتا ہے‘ ہم سب اس سے واقف ہیں اور یہ معاملہ بہرحال خطرناک ہے۔ ہم صرف ٹیکنالوجی کے صارفین ہی نہیں‘ موجد بھی بنتے جا رہے ہیں۔ ماڈرن ٹیکنالوجی میں پروڈیوسر اور کنزیومر کا فرق بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اسی لیے اب ڈیجیٹل میڈیا میں کچھ پلیٹ فارمز پر اس کے لیے ایک لفظ Prosumer استعمال ہوتا ہے۔ یہ پروڈیوسر بھی ہیں اور ساتھ کنزیومر بھی۔

جو لوگ ٹیکنالوجی‘ انفارمیشن ٹیکنالوجی یا اس طرح کی دیگر فیلڈز میں کام کرتے ہیں‘ انہیں تجربہ ہے کہ یہ بہت وقت لینے والی چیزیں ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا ایک بڑا مقصد ''اِغتنام الاوقات'' ہوتا تھا یعنی اپنے اوقات کو قیمتی بنانا‘ ان سے غنیمت حاصل کرنا۔ پہلے ہم کہیں پر بھی بیٹھے ہوتے تھے اور کچھ فرصت کے لمحات میسر ہوتے تو ذکر کرنے لگتے یا کچھ مطالعہ کر لیتے تھے۔ اب لوگ کہیں پر بھی بیٹھے ہوں تو ایسے نہیں بیٹھتے‘ چند منٹ بھی ان کو بیٹھنا ہو تو سب اپنا موبائل نکال کر اس کے اندر مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ یہ جو بظاہر ٹیکنالوجی کا ایک آلہ ہے‘ اس نے ہمیں بہت فوائد بھی دیے ہیں‘ لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ ہمارے وقت کو نگلتا چلا جا رہا ہے! ٹیکنالوجی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے وقت بچایا ہے۔ پہلے لوگ اونٹوں اور گھوڑوں پر سفر کرتے تھے اور اتنا وقت لگتا تھا‘ فلاں کام کرنے میں اتنے گھنٹے لگتے تھے‘ اب وہ منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سارا وقت بچا کر انسان نے کیا کیا؟ کیا اس وقت کو اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھانے میں استعمال کیا؟ کیا اس وقت کو انسانوں سے تعلق قائم کرنے میں استعمال کیا؟ یا پھر اس وقت کو اسی ٹیکنالوجی کے آگے نثار کر دیا؟ یعنی جو وقت بچتا ہے وہ بھی تو اسی کے آگے ختم ہو جاتا ہے۔ اس ٹیکنالوجی ہی کو دیکھتے دیکھتے گھنٹے گزر جائیں گے اور آپ کو معلوم ہی نہیں ہوگا۔ شطرنج کی حرمت پر ہمارے ہاں فتاویٰ دیے گئے‘ اس میں بھی یہ بات پیشِ نظر تھی کہ یہ ایک ایسا کھیل ہے جس میں آدمی بالکل گم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ ماڈرن ٹیکنالوجی انسانوں کو ایسے possess کر لیتی ہے کہ اس کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

ٹیکنالوجی کا دوسرا ہدف ''توجّہ'' ہے۔ اٹینشن اکانومی سب سے بڑی اکانومی ہے۔ موجودہ عالَم ''صورتوں کا عالَم'' ہے۔ اس امیج کلچر میں ہم سب کھو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا تھا کہ ہم حقیقت سے مناسبت پیدا کریں‘ لیکن ہم نے اتنی صورتیں بڑھا لی ہیں کہ حقیقت سے یا غیب سے متعلق ہونے کے قابل نہیں رہے۔ قاری طیب قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ ہے ''تصویر: قرآن کے آئینے میں''‘ کہ جتنا زیادہ ہم تصویروں میں مشغول رہیں گے اور ہماری توجّہ ان پر مرکوز رہے گی اتنا زیادہ ہم حقیقت سے بیزار ہوتے جائیں گے اور غیب سے تعلق قائم

رکھنے کے قابل نہیں رہیں گے۔

تیسرا ہدف ہم نے ذکر کیا ''کشش''۔ ٹیکنالوجی کے ذریعے دنیا کی کشش میں غیر معمولی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ Rudolf Otto کی ایک کتاب ہے: The Idea of The Holy۔ یہ جو لوگوں میں ایک تقدیس کا تصوّر تھا اور اس میں پُراسراریت ہوتی تھی' ایک دبدبہ ہوتا تھا اور یہ انسانوں کو معبدوں' مسجدوں' کلیساؤں اور مندروں میں جا کر حاصل ہوتی تھی اور ایک ہیبت طاری ہو جاتی تھی' اب یہ سارا گریجر لوگوں کو شاپنگ مالز اور اسٹیڈیمز کے اندر محسوس ہوتا ہے۔ George Ritzer نے کہا ہے کہ یہ شاپنگ مالز Cathedrals of Consumption ہیں۔ لوگ جب دبئی جا کر شاپنگ مالز دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔ جو کچھ ٹیکنالوجی میں ان کو دکھایا جا رہا ہے' اس میں ایسا تعجب اور ایسی حیرانی ہے کہ اس سے کشش میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کا ایک سادہ سا تجربہ کر کے دیکھ لیں! آج سے کوئی چالیس پچاس سال پہلے کا کرکٹ میچ دیکھ لیں اور پھر آج کل کی ویڈیو دیکھ لیں۔ یہ جو رنگ و نور اس کے اندر آ گیا ہے' اب وہ کوئی سادہ کھیل تھوڑی رہا ہے۔ یوں کہیے کہ اب تو سپورٹس اور انٹرٹینمنٹ کی شادی ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکنالوجی نے دنیا میں کشش کو از حد بڑھا دیا ہے۔

خمول

ہمارے بزرگوں میں ایک بہت بڑی قدر تھی جسے ''خمول'' کہا جاتا تھا۔ اس کا مطلب ہے ''گمنامی''' یعنی لوگ یہ چاہیں کہ ہم مشہور نہ ہوں' ہمیں شہرت حاصل نہ ہو۔ ماڈرن میڈیا' یعنی ڈیجیٹل اور الیکٹرانک میڈیا' تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے شہرت کے کارخانے ہیں۔ اس میں آدمی ایک دفعہ چلا جائے تو اسے خود اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنی جلدی وہ اس جال میں آ جاتا ہے۔ اس پھندے میں بہت سے علماء بھی آ جاتے ہیں۔ اس پر غور کرنا چاہیے کہ خمول کی قدر کیسے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ تواضع اختیار کرنا یا شہرت سے بھاگنا' یا اپنی تعریف کو پسند نہ کرنا' یہ اوصاف کیوں معدوم ہوتے جا رہے ہیں؟ یہ جو سوشل میڈیا پر ہم ایک پوسٹ کرتے ہیں اور اس پر داد کے ڈونگرے برسنے شروع ہو جاتے ہیں' ہر طرف تعریفیں ہو رہی ہوتی ہیں' یہ ابنارمل ہے۔ یعنی اس دنیا سے باہر نکل جائیں تو نارمل دنیا میں ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں چار شعراء اور چھ اقوالِ زرّیں نقل کیے اور ہر ایک پر آٹھ دس بے وقوفوں نے آ کر ستارے بنا دیے۔ ایک انجمن ستائش باہمی بنا رکھی ہے اور سب بے وقوف مل کر ایک دوسرے کو خوش رکھتے ہیں۔

من ترا حاجی بگویم تو مرا مُلّا بگو!

وہ لوگ جو بہت زیادہ اس میڈیا کے سحر میں مبتلا ہیں' ایک تو وہ نرگسیت سے نہیں نکل پاتے اور دوسرا وہ بازاری پن سے نہیں بچ سکتے۔ ہم میں بعض ایسے علماء اور مفتیانِ کرام بھی ہیں' ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ عام گفتگو میں ایسے لطیفے سنائیں جو وہ اس میڈیا پر جا کر کر دیتے ہیں۔ اس لیے Marshall McLuhan نے کہا تھا: The Medium is the Message۔ اس میڈیم کے ساتھ کچھ چیزیں جڑی ہوئی ہیں جن سے ہم اس کو نکال نہیں سکتے۔ مثلاً ٹی وی انٹرٹینمنٹ کا بنیادی میڈیم ہے۔ اس میں کوئی مذہبی پروگرام بھی آئے گا تو اگر وہ

entertaining نہیں ہے تو نہیں چلے گا۔ اس کو انٹرٹینمنٹ کے انداز میں ہی بیان کرنا اور چلانا پڑے گا۔ اب تو یہ ذوق بلکہ بدذوقی بہت بڑھ گئی ہے کہ علماء بھی لطیفے سنائیں اور چٹکلے چھوڑیں' اور پھر ان کا کلپ وائرل ہو جائے۔ ستم بالائے ستم کہ اسے مذہبی لوگ ہنستے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو بھیجنے لگیں۔ لہٰذا اس طرف لوگ سوچ ہی نہیں رہے کہ ان کی دینی اقدار کو اس سے کہاں کہاں پر نقصان ہو رہا ہے اور کہاں کہاں اسے ڈینٹ لگ رہا ہے۔

حرفِ آخر

ٹیکنالوجی کے اندر مستقل طور پر بہتر سے بہتر ہونے کا معاملہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آنے والی ایجاد پچھلی ایجاد سے بہتر ہے' ہر آنے والا زمانہ پہلے والے زمانے سے بہتر ہے۔ کبھی اسی پر غور کر لیں کہ ہمارے سلف سے جو ہمارا تعلق ہے' اس کو کیسے نقصان پہنچ رہا ہے! کبھی غور کیجیے گا کہ آپ کے بچے جس ماحول اور جس طریقے سے پل رہے ہیں اور جس طرح gadget استعمال کر رہے ہیں' جب بڑے ہو کر ان کو یہ بتایا جائے گا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس یہ سب ذرائع نہیں تھے' تو مجھے بہت ڈر ہے کہ پیغمبرؐ کے بارے میں ان کی رائے بہت عجیب سی ہو جائے گی۔ بہت پریشانی بھی ہوگی اور خیال بھی ہوگا کہ ان سب کے بغیر زندگی کا کیا مطلب ہے! اس کے بغیر اتنی ذہانت کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر کوئی بڑا کام کیسے کیا جا سکتا ہے! اس پر بھی کبھی غور کیجیے گا جو C.S.Lewis نے کہا کہ ہم chronological snobbery کا شکار ہیں' یعنی جو چیز جتنی نئی ہے اتنی اچھی ہے' اور جو پچھلے زمانے کی چیزیں ہیں' چاہے ٹیکنالوجی یا علم' وہ ادنیٰ ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ٹیکنالوجی کے اس دجل کو سمجھنے کی توفیق دے اور اس کے فتنے سے محفوظ رکھے۔ کوئی آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے بالکل متاثر نہیں ہو رہا۔ ہم سب پر اس کا اثر ہو رہا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس کو ریگولرائز کرنے کی کوشش کریں۔ جب کبھی اس کو استعمال کریں تو ایک حذر کے ساتھ۔ اسے ایک inevitable چیز سمجھ کر نہ لیں اور اس کے اخلاقی پہلوؤں پر بھی نظر رکھیں۔ ❁❁❁

بقیہ: فہم القرآن

آیت: آیت ۳۹ کی تشریح یہ ہے کہ بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال سے انسان کی عمر اور رزق میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ بخاری میں ہے کہ صلہ رحمی عمر میں زیادتی کا سبب بنتی ہے۔ مسند احمد کی روایات میں ہے کہ بعض اوقات آدمی کوئی ایسا گناہ کرتا ہے کہ اس کے سبب سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور ماں باپ کی خدمت واطاعت سے عمر بڑھ جاتی ہے اور تقدیر الٰہی کو کوئی چیز بجز دعا کے ٹال نہیں سکتی۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کی تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں اور دعا کی وجہ سے تقدیر بدلی جا سکتی ہے۔ (معارف القرآن) ❁❁❁

مباحثِ عقیدہ (۱۵)

مؤمن محمود

''اِلجام العوام من علم الکلام'' کی صحیح توجیہہ

آج کا موضوع صفت علم ہی ہے لیکن اس پر گفتگو سے پہلے گزشتہ موضوع کے حوالے سے چند وضاحتیں عرض کروں گا۔ بعض لوگوں نے یہ اشکال ظاہر کیا کہ علم الکلام یا علم عقیدہ کی جو تعریف بیان کی گئی' اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے لیے ضروری ہے' کیونکہ بیانِ عقائد اور اثباتِ عقائد کی ہر شخص کو حاجت ہے کہ وہ جانے کہ عقائد اور ان کے دلائل کیا ہیں۔ لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ امام غزالیؒ نے اس موضوع پر کتاب لکھی ہے کہ عوام الناس کو علم الکلام سے دور رکھا جائے! ان کی ایک کتاب کا عنوان ہے: اِلجام العوام من علم الکلام۔ یعنی عوام کو علم کلام سے لگام دے کر رکھی جائے۔ ان کو اس کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ امام غزالیؒ کے اس قول کی کیا توجیہہ ہے؟ وہ کون سا علم کلام ہے جس سے امام غزالیؒ عوام الناس کو منع فرما رہے ہیں کہ وہ اس میں مشغول ہوں یا اس کے قریب جائیں؟ جیسا کہ ہم نے علم الکلام کی مختلف تعریف دیکھی تھی جس میں اکثر علماء نے علم الکلام کے تین حصے کیے ہیں:

۱۔ بیانِ عقائد ۲۔ اثباتِ عقائد ۳۔ دفع الشبہات

امام غزالیؒ نے جہاں علم الکلام سے لوگوں کو روکا ہے وہاں دفع الشبہات کا بیان ہے۔ یعنی جن عوام الناس پر ابھی کوئی شبہ وارد نہیں ہوا تو ان کے سامنے شبہات کو بیان کر کے اس کا رد کرنے کا کوئی مقصد اور فائدہ نہیں ہے بلکہ ضرر زیادہ ہے۔ اسی لیے امام غزالیؒ ''احیاء العلوم'' میں فرماتے ہیں کہ علم الکلام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عوام الناس کے عقیدے کی حفاظت کی جائے اور جو شبہات ان پر وارد ہوتے ہیں ان کو دفع اور رد کیا جائے۔ ان کے بقول علم الکلام بس دوا کی مانند ہے۔ اگر بیماری آجائے گی تو آپ اس بیماری کو دور کرنے کے لیے دوا اختیار کریں گے اور اگر آدمی صحت مند ہے اور اسے بیماریاں لاحق نہیں ہیں تو اسے دوا دینے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ''اِلجام العوام من علم الکلام'' کا معنی یہ ہے کہ وہ عوام الناس جو ایک صحیح عقیدہ رکھتے ہوں اور کسی قسم کے شبہات میں مبتلا نہیں ہیں' تو ان کے سامنے ہم شبہات کا بیان کر کے رد نہیں کریں گے بلکہ ان کو اسی عقیدے پر رکھیں گے جو انہوں نے اپنے والدین سے حاصل کیا۔ یہی منہج امام احمد بن حنبلؒ کا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ اپنے زمانے کے کچھ بڑے بزرگوں (متکلمین) سے اس مسئلے پر ناراض ہو جاتے تھے۔ امام حارث المحاسبیؒ صوفی اور متکلم تھے۔ ان سے امام احمدؒ کی ناراضی ہو گئی صرف اس مسئلے پر کہ تم جب معتزلہ اور جہمیہ پر رد کرتے ہو تو اپنی کتابوں میں پہلے ان

کے شبہات بیان کرتے ہو، پھر ان کا رد کرتے ہو، حالانکہ بہت سے لوگوں نے کبھی معتزلہ کو سنا بھی نہیں ہے اور جانتے بھی نہیں ہیں، لیکن جب وہ تمہاری کتابیں پڑھتے ہیں تو ان کو ان شبہات کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک عامی کو تمہارا جواب تو سمجھ نہ آئے لیکن وہ شبہ سمجھ میں آ جائے اور وہ اس شبہ کی وجہ سے اپنا عقیدہ کھو بیٹھے۔ بہرحال امام غزالیؒ ''اِلجام العوام من علم الکلام'' کہہ کر امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک کا بیان فرما رہے ہیں کہ جہاں شبہ نہیں ہے، جہاں صحت حاصل ہے وہاں دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ امام غزالیؒ عوام الناس کے لیے جو عقائد کا بیان کر رہے ہیں وہ دلائل کے ساتھ ہے۔ مثال کے طور پر ''احیاء العلوم'' میں ان کی ایک کتاب شامل ہے جس کا نام ہے: ''قواعد العقائد''۔ یہ کتاب انہوں نے الگ سے تصنیف کی تھی اور الگ سے بھی چھپتی ہے اور بعد میں ''احیاء العلوم'' میں بھی شامل کر دی گئی۔ بعض علماء کے نزدیک اصلاً ''احیاء العلوم'' میں شامل تھی۔ لیکن وہ ایک مستقل کتاب ہے۔ ''احیاء العلوم'' میں پہلی کتاب ''کتاب العلم'' ہے جبکہ دوسری کتاب ''قواعد العقائد'' ہے۔ آپ اگر اس کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں بیان العقائد ہے دلائل کے ساتھ۔ گویا معلوم ہو جائے گا کہ وہ چاہ رہے ہیں کہ عوام الناس کو بھی دلائل کے ساتھ عقائد کا بیان کیا جائے لیکن یہ نہیں چاہ رہے ہیں کہ خوامخواہ ایسے شبہات بیان کیے جائیں کہ جو ان کے ذہنوں میں ابھی تک نہیں اُٹھے۔ یہ امام صاحب کا مسلک ہے۔

علم الکلام کے حوالے سے امام غزالیؒ کا مسلک

کچھ لوگوں نے کہا کہ امام غزالیؒ ابتدائی زمانے میں علم الکلام کے قائل تھے، لیکن جب ان پر تصوف کا دور آیا اور ایک ایسا زمانہ بھی آیا کہ وہ تقریباً نو سال سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے تو اس کے بعد علم الکلام کے قائل نہیں رہے اور ان کا نکتہ نظر یہ ہو گیا کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے اصلاً تصوف کی راہ ہے۔ جیسا کہ ''المنقض من الضلال'' سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔ اس موقف کو رد کرنے کے لیے صرف ایک بات کافی ہے کہ اصولِ فقہ پر ان کی آخری کتاب ''المستصفٰی'' ہے۔ ''احیاء العلوم'' کی تصنیف کے بعد جب انہوں نے واپس آ کر مدرسہ نظامیہ میں پڑھانا شروع کر دیا تو اس کے بعد کی تصنیفات میں سے ایک کتاب ہے المستصفٰی۔ اس کے مقدمہ میں وہ علم الکلام کو تمام علومِ شرعیہ کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ کس طرح تمام علوم علم الکلام سے استفادہ کرتے ہیں اور علم الکلام ان میں سے کسی علم سے استفادہ نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ امام صاحبؒ آخری زمانے میں اس کے قائل نہیں تھے، یہ بے بنیاد باتیں ہیں۔ علم الکلام کا بنیادی مقصد چونکہ بیانِ عقائد اور اثباتِ عقائد ہے تو کون ہوگا جو اس منہج کا قائل نہ ہو کہ شبہات اگر وارد ہو جائیں تو دلائل سے جواب دینا ہے؟ امام صاحب خصوصاً یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا زمانہ یا جگہ ہو جائے کہ جہاں شبہات اور باطل افکار و خیالات بہت زیادہ وارد ہونا شروع ہو جائیں تو اس زمانے میں تو ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقائد کا اتنا علم ضرور حاصل کرے کہ جس کی بنیاد پر وہ علیٰ وجہ البصیرۃ ایمان لا سکے۔ لہٰذا امام صاحبؒ کے بارے میں جو بات بیان کی جاتی ہے وہ

درست نہیں ہے' بلکہ ان کے اقوال سے جہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ علم الکلام کو ڈی گریڈ کر رہے ہیں یا عوام الناس کو اس سے دور رہنے کی تلقین کر رہے ہیں تو وہاں محض شبہات کا بیان ہے۔ جہاں صحت ہے وہاں دوا کی حاجت نہیں ہے اور جہاں مرض آچکا ہے وہاں دوا کی حاجت ہے اور علم الکلام شبہات کے رد کے حوالے سے دوا کی مانند ہے جو ہر ایک کو اس کے مرض کے اعتبار سے اور بقدر مرض دی جائے گی۔ بہرحال مَیں نے امام غزالیؒ کے موقف کے حوالے سے ضروری وضاحت کر دی ہے۔ اس موضوع پر موجودہ دور کے علماء نے کتابیں لکھی ہیں' ان میں بہترین کتاب ''موقف الغزالی من علم الکلام '' ہے' جس میں امام غزالیؒ کا علم الکلام کے حوالے سے موقف دلائل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ آج کے دور کے متکلم شیخ سعید فودہ کی بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں' اس وقت ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفاتِ معنی پر گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جن میں ہم اللہ سبحانہ تعالیٰ کے حق میں ایک صفت وجودی کا اثبات کرتے ہیں۔ ان صفات میں ہم دو صفات دیکھ چکے ہیں۔ پہلی صفت قدرت ہے جس سے ممکنات (جن کو اللہ تعالیٰ اپنے ارادے سے وجود دینا چاہتا ہے) وجود میں آجاتی ہیں۔ دوسری صفت ارادہ ہے جس پر اللہ کے فضل سے تفصیلی گفتگو ہوئی' کیونکہ یہ بہت اہم صفت ہے۔ اس حوالے سے بہت سے لوگوں کے اشکالات تھے اور بہت سے باطل فرقوں' فلاسفہ اور معتزلہ نے اس صفت کو کسی نہ کسی طریقے سے نہیں مانا' چنانچہ ہم نے دیکھا کہ اہلِ سُنّت کس طور سے اس کا اثبات کرتے ہیں۔ اس صفت کا مطلب یہ ہے کہ ممکنات جتنی بھی ہیں وہ اللہ کی قدرت سے ایک جیسی نسبت رکھتی ہیں' لیکن فلاں ممکن وجود میں آتا ہے اور فلاں ممکن وجود میں نہیں آتا' تو کون سی صفت ہے جو ان موجودات کی تخصیص کرتی ہے کہ کس کو وجود دیا جائے اور کس کو عدم کا شکار کر دیا جائے۔ اور کس کو وجود دیا جائے اس ہیئت اور صورت میں اور کس کو وجود دیا جائے کسی اور ہیئت اور صورت میں؟ اس کی تخصیص کرنے والی صفت کو صفت ارادہ کہتے ہیں۔ تیسری صفت جس کا ہم نے پچھلے ہفتے بیان شروع کیا تھا وہ صفت علم ہے۔ اس میں ہم نے امام البیہقیؒ کی کتاب: ''الاسماء والصفات'' میں سے کچھ چیزیں پڑھیں اور دیکھا کہ امام صاحبؒ کن کن آیات سے استدلال فرما رہے ہیں۔ ان آیات میں ایک مشہور آیت تھی:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾﴾

(الانعام)

''اور اُسی کے پاس غیب کے سارے خزانے ہیں' کوئی نہیں جانتا اُن (خزانوں) کو سوائے اُس کے' اور وہ جانتا ہے جو کچھ ہے خشکی میں اور سمندر میں۔ اور نہیں گرتا کوئی ایک پتا بھی (کسی درخت سے) مگر وہ اُس کے علم میں ہوتا ہے اور نہیں (گرتا) کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں' اور نہ کوئی تر و تازہ اور نہ کوئی سوکھی چیز' مگر ایک کتابِ مبین میں (سب کی سب) موجود ہیں۔''

اسی طرح سورۃ المجادلہ کی آیت (۷) جو مَیں نے آپ کے سامنے پڑھی: ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کوئی نجویٰ نہیں ہوتا تین کے درمیان مگر ان کا چوتھا اللہ ہے' اور نہ پانچ کے درمیان مگر ان کا چھٹا اللہ ہے' اور نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم مگر اللہ ان کے ساتھ ہے جہاں بھی وہ ہوتے ہیں۔'' یہ صفت معیت ہے ﴿اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾۔ اسی طرح سورۃ الحدید میں بھی صفت معیت کا بیان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴﴾

''وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ نکلتا ہے اس سے' اور جو کچھ اترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معیت معیتِ علمی ہے

''وہ جانتا ہے جو آسمانوں سے اترتا ہے اور جو کچھ آسمانوں کی طرف چڑھتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہوتے ہو''۔ صحابہؓ اور علماء سلف نے کہا کہ یہ صفت معیت بھی صفت علم کا بیان ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ' عبداللہ بن مسعودؓ اور بہت سے صحابہ سے اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ ''وَهُوَ مَعَكُمْ بِعِلْمِهٖ''، یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے علم محیط اور علم شامل کے اعتبار سے تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ کی معیت صفاتی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت' اپنے علم اور اپنی دوسری صفات کے اعتبار سے ہر وقت تمہارے ساتھ ہے۔ تو صفت معیت بھی صفت علم کا بیان تھا۔ قرآن مجید صفت علم کے اثبات سے بھرا ہوا ہے' کوئی صفحہ ایسا نہ ملے گا جس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف صفت علم کی نسبت نہ کی گئی ہو۔ کبھی اس بات کا بیان ہوتا ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو جانتا ہے اور کبھی اس بات کا بیان ہوتا ہے کہ جو تمہارے اندر ہے وہ جانتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفَى ۝۷﴾ (طٰہٰ)

''اور اگر تم بلند آواز سے کوئی بات کرو' وہ تو یقیناً جانتا ہے چھپی بات کو بھی اور نہایت مخفی بات کو بھی۔''

اگر زور سے بول لو تب بھی بات تو ایسی ہے' کیونکہ اللہ تو سر اور اس سے بھی جو مخفی ہے اسے بھی جانتا ہے۔ اسی طریقے پر دوسری آیات ہیں۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝۹۹﴾ (المائدہ)

''اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔''

گویا جو نقلی دلائل ہیں جن کو ہم سمعی دلائل کہتے ہیں' جو وحی کے نتیجے میں ہم تک پہنچے ہیں وہ تمام دلائل اس پر شاہد ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ''العلیم'' ہے۔ ہم نے یہ بات بھی دیکھی کہ قرآن مجید کے چند عمومات ایسے ہیں جن میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یعنی لفظ عام ہوتا ہے لیکن کسی نہ کسی دلیل نے اسے خاص کر دیا ہوتا ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ ''اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے'' میں كُلُّ شَيْءٍ صیغہ عموم

ہے‘اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے؟ کیا کوئی چیز ایسی ہے جو اللہ کے علم سے خارج ہوجائے اور ہم اسے خاص کردیں؟ نہیں! یہاں یہ آیت اپنے عموم پر ہے۔ کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم سے خارج ہو‘ چاہے وہ موجودات ہوں یا ممکنات ہوں (جو ابھی وجود میں نہیں آئیں) اور ایسی اشیاء بھی جن کو اللہ چاہتا تو وجود دے دیتا لیکن اللہ نے نہ دیا۔ اللہ تعالیٰ جو واجب الوجود ہے‘ خود اپنے آپ کو بھی جانتا ہے اور ان اشیاء کو بھی جانتا ہے جو مستحیل ہیں‘ جو وجود میں نہیں آسکتیں۔ بہرحال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت علم واجبات‘ ممکنات اور مستحیلات تینوں سے متعلق ہے‘ کیونکہ ہم نے صفت ارادہ اور صفت قدرت میں دیکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات صرف ممکنات سے متعلق ہوتی ہیں۔ چونکہ وہ واجب الوجود ہے اس کو تو عدم کا شکار ہی نہیں کیا جاسکتا اور مستحیل ایک مہمل شے ہے اس کو وجود نہیں دیا جاسکتا‘ لیکن صفتِ علم کے متعلقات سب سے زیادہ وسیع ہیں۔ تو صفتِ علم ممکن سے بھی متعلق ہے‘ صفتِ علم واجب سے بھی متعلق ہے‘ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے متعلق ہے یعنی اپنی ذات سے۔ جیسے کہ ہم جانتے ہیں: ’’لَا یَعْرِفُ اللّٰہَ اِلَّا ھُوَ‘‘ اللہ کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔‘‘

صفات کی تعریف ماہیت صفات کا بیان نہیں ہے

صفتِ علم کی تعریف پہلے بیان کی گئی تھی‘ اس کو دوبارہ تازہ کرلیجیے۔ تعریف کا مطلب ہوتا ہے کہ یہ تقریب ہے۔ یعنی جب ہم تعریف‘ definition یا حد کہتے ہیں تو مناطقہ (اہلِ منطق) کے ہاں حد ایک خاص تصور رکھتی ہے۔ اہلِ منطق کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ یا اس کی صفات کی تعریف ایسے نہیں ہوسکتی جیسے ہم منطق میں دوسری چیزوں کی تعریف کرتے ہیں‘ کیونکہ کسی بھی شے کی تعریف کرتے وقت اس کی نوع بنانے کے لیے اس سے اوپر والی جنس کو نقل کرتے ہیں۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مانند کوئی ہے ہی نہیں‘ لہٰذا وہ ان تمام اجناس اور انواع (species) سے ماوراء ہے۔ وہاں اس طریقے پر تعریف نہیں ہوسکتی کہ جس میں کسی شے کی حقیقت اور ماہیت کا بیان ہوجائے۔ چنانچہ ہم صفت کی تعریف کرتے ہیں جس سے صفت قریب المعنیٰ ہوجاتی ہے تقریب الی الذہن کے لیے۔ البتہ حقیقت کے بیان کے لیے نہیں ہوتی‘ کیونکہ اللہ کی صفات اور ذات کی حقیقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بہرحال تقریب للذہن کے لیے یہ تعریف اختیار کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں: صفة ازلية قائمة بذات الله تتعلق بجميع الممكنات والممتنعات والواجبات۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے جو صفت ازلی قائم ہے وہ متعلق ہوتی ہے تمام جائزات‘ تمام واجبات اور تمام مستحیلات (ممتنعات) سے۔ علی سبیل الانکشاف ایسے متعلق ہوتی ہے کہ اسے منکشف کردیتی ہے۔ من غیر خفاء بغیر کسی خفا کے۔ یعنی بغیر کسی پردے یا اوٹ کے۔ ولا سبق جهل اور نہ وہ صفت ایسے ہے کہ اس سے پہلے جہالت آتی ہو۔ کیونکہ انسانی علوم مسبوق بالجہل ہیں۔ پہلے ہم نہیں جانتے اور پھر جان لیتے ہیں۔ لہٰذا ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے عالم یا علیم یا علام تو بولتے ہیں لیکن باقی وہ الفاظ جو یہی معنی رکھتے ہیں وہ ہم اللہ کے حق میں استعمال نہیں کرتے‘ اس لیے کہ اس میں ایہام ہے‘ اس میں تو ہم پیدا ہوتا ہے کہ شاید کوئی شے معلوم نہیں تھی اور پھر جان لی۔ جیسے ہم اللہ کے

لیے عارف نہیں بولتے جبکہ اپنے لیے کئی مرتبہ عارف ایسے بولتے ہیں جیسے کہ یہ عالم سے اوپر کا درجہ ہے۔ فلاں عارف باللہ ہے' یعنی عالم باللہ سے بھی کوئی اگلا مقام ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے لفظ ''عارف'' استعمال کرنا نامناسب ہے

امام راغب الاصفہانیؒ فرماتے ہیں ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ''عارف'' نہیں کہتے۔ کیونکہ عارف کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے کوئی شے پہلے معلوم نہیں تھی اور معلوم ہوگئی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں ایسا نہیں ہوسکتا کہ پہلے جہالت ہو (نعوذ باللہ) اور پھر اللہ کسی شے کو جان لے۔ انہوں نے مثال دی کہ جیسے آپ اپنے کسی دوست کو دیکھیں اور بہت عرصے کے بعد اس سے آپ کی ملاقات ہوئی ہو تو آپ اس کو دیکھ کر پہلے پہچانیں گے نہیں اور پھر آپ پہچان لیں گے تو کہیں گے: ''عَرَفْتُکَ'' میں نے تم کو پہچان لیا''۔ کہتے ہیں وہاں آپ یہ نہیں بول سکتے: عَلِمْتُکَ ''میں نے تمہیں جان لیا'' کیونکہ علم کے اندر پہلے سے جہالت کا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن معرفت کے اندر پہلے سے جہالت کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا وہاں ''علمتک'' کا لفظ نہیں بولا جاسکتا بلکہ ''عرفتک'' بولا جائے گا۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے لیے عاقل اور فقیہ بھی نہیں بولتے۔ فقہ یہ ہے کہ ذہن کو استعمال کر کے کسی شے کو گہرائی میں سمجھ لینا۔ لہٰذا فقہ کے اندر دماغی محنت شامل ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں اس طریقے پر چیزوں کو نہیں جانا جاتا کہ اللہ سوچ بچار کرے اور اس کے نتیجے میں ایک رائے تک پہنچ جائے اور معرفت حاصل ہوجائے۔ نعوذ باللہ! جیسے کہ انسان کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے کسی لفظ کا اثبات نہیں ہوسکتا کہ جس کے اندر سبق جاہل کا مفہوم ہو' یعنی اس علم سے پہلے جہالت کا اثبات ہو رہا ہو۔ بہرحال جو ہم نے تعریف پڑھی' اس میں یہ بات بھی علماء نے شامل کردی: علی سبیل الانکشاف کہ وہ شے اللہ کے علم سے منکشف ہوجاتی ہے۔ من غیر خفاء بغیر کسی اوجھل پن کے۔ ولاسبق جہل اور بغیر کسی جہالت کے مسبوق ہوئے۔ یعنی پہلے سے اسے جہالت نہیں ہوتی' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم مسبوق بالجہل نہیں ہوتا۔

علم کی تعریف کا مسئلہ

یہ فرق بیان کرنے کے لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم ہمارے علم کی مانند نہیں ہے' علماء نے انسانی علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلی بات یہ کہ وہ علم کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ متکلمین کا اس پر اتفاق ہے کہ علم کی ایسی حد نہیں بیان کی جاسکی (حد سے مراد ہے definition یا تعریف) جس پر کچھ اعتراضات وارد نہ ہوتے ہوں۔ لہٰذا علم کے حوالے سے جتنی بھی تعریفات کی گئی ہیں کہ علم کیا ہے' کیا علم مقولہ کیف میں سے ہے یا مقولہ فعل میں سے ہے یا مقولہ انفعال میں سے ہے؟ یعنی متکلمین میں یہ اختلاف ہے۔ منطق میں جو دس کیٹیگریز ہیں' ان میں ایک کیف ہے' ایک انفعال ہے اور ایک فعل ہے۔ کہتے ہیں کہ علم میں کیا ہمارا ذہن فعال ہوتا ہے؟ اس معلوم پر تو یہ مقولہ فعل میں سے ہوجائے گا' یا محض ہمارا ذہن قبول کر رہا ہوتا ہے تو یہ مقولہ انفعال میں سے ہوجائے گا' یا فعل اور انفعال سے مل کر ایک کیفیت بنتی ہے تو یہ مقولہ کیف میں سے ہوجائے گا۔ یعنی یہ ساری باتیں زیر بحث

لائی گئی ہیں جو آج کے علوم میں بھی لائی جاتی ہیں کہ جب ہم باہر کی شے کو سمجھ رہے ہوتے ہیں تو اس میں باہر کی شے کتنی ہوتی ہے اور ہمارے ذہن کا عمل دخل کتنا ہوتا ہے؟ یہ مقولہ کیف' مقولہ انفعال اور مقولہ فعل وغیرہ' سب وہی باتیں ہیں جو بعد میں مغربی فلسفے میں بھی کی جاتی رہیں کہ مائنڈ سے باہر independent matter موجود ہے یا نہیں؟ اور ذہن کا اس میں عمل دخل کتنا ہے؟ اور جس طرح کی صورت ہمارے ذہن میں آ رہی ہوتی ہے' خارج میں اسی طرح موجود ہے یا نہیں؟ یا ہمارے ذہن کی کچھ کیٹیگریز ہیں جن سے ہم نے اس کو اس طرح سمجھ لیا' چاہے وہ زمان ہے یا مکان ہے؟ وغیرہ۔ بہرحال یہ سارے خیالات وافکار متکلمین زیر بحث لائے ہیں۔ اس کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم علم کی تعریف کرو گے تو علم کے اندر کچھ نہ کچھ جہالت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک بڑے متکلم نے یوں مثال دی کہ جب آپ علم کو define کریں گے تو اس کو علم کے ساتھ کریں گے یا جہالت کے ساتھ۔ یعنی اگر آپ علم کو define علم کے ساتھ کر رہے ہیں تو گویا علم کی معرفت پہلے سے حاصل ہے۔ اور اگر آپ علم کو define کرتے ہو اور علم ہی کو نہیں جانتے تو علم کی defenition ممکن نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ بدیہی امور میں سے ہے۔ یعنی یہ ایسے بدیہی امور میں سے ہے کہ جس کی تعریف جب کر دی جاتی ہے تو اس کے اندر خفا اور غموض پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا علم کو سب جانتے ہیں۔ آپ سے جب پوچھا جائے تو آپ کہیں گے کہ مجھے پتا ہے علم کیا ہوتا ہے' اس وقت فلاں شے کو جاننے کے بعد جو میری کیفیت ہے یہ بس علم ہے۔ بہرحال انہوں نے علم کی بے شمار تعریفیں کی ہیں لیکن ہم نے یہ جاننا ہے کہ اللہ کا علم کیسے مختلف ہے!

علم حصولی اور علم حضوری

اس حوالے سے علماء نے کہا کہ انسانی علم دو حصوں میں منقسم ہے:

۱۔ علم حصولی ۲۔ علم حضوری

یہ اصطلاحات منطق میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور ہمارے علم کلام میں بھی۔ ان کے نزدیک علم حصولی یہ ہے کہ خارج میں جو شے ہے اس کا علم بالواسطہ حاصل ہو۔ یعنی علم بالواسطہ کو علم حصولی کہتے ہیں اور علم بلاواسطہ کو علم حضوری کہتے ہیں۔ جیسے خارج میں ایک گلاس ہے' گلاس کا علم آپ کو حاصل ہو گیا' آپ نے تعقل کیا' لیکن یہ علم آپ کو حاصل ہو رہا ہے اس صورت کے واسطے سے جو آپ کے خیال میں مرتسم ہو گئی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی خارجی شے کی صورت ذہن میں آ جاتی ہے' اس کو کہتے ہیں: حصول صورۃ الشئ فی الذھن خارج میں کسی شے کی صورت کا ذہن میں واقع ہو جانا۔ یہ علم حاصل تو ہوا ہے لیکن واسطے سے حاصل ہوا ہے اور وہ واسطہ کیا ہے: صورت۔ وہ تصویر جو آپ کے خیال میں مرتسم ہوئی ہے اس کے نتیجے میں آپ کو علم حاصل ہوا ہے اور یہ علم بالواسطہ ہے بلاواسطہ نہیں ہے۔ آپ کہیں کہ کئی دفعہ کسی صورت کے بتانے سے آپ کو علم حاصل ہو جاتا ہے' کیونکہ بتانے میں بھی الفاظ ہوتے ہیں۔ الفاظ کی صورت آپ کے ذہن میں مرتسم اور نقش ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں آپ علم حاصل کرتے ہیں۔ جتنے بھی علوم خارج سے حاصل ہو رہے ہوتے ہیں وہ بلاواسطہ نہیں ہوتے۔ یہ اہم بات ہے۔

ہوسکتا ہے کوئی شخص جدید فلسفہ پڑھ کر کہے کہ انہوں نے بڑی باتیں نکال لیں' یہ واقعی میٹر اور مائنڈ کا پرابلم ہے' اس کے درمیان میں واسطہ ہے کہ نہیں ہے؟ وغیرہ' تو متکلمین یہی کہہ رہے تھے کہ علم حصولی کبھی ڈائریکٹ علم خارج کا نہیں ہوتا' ہمیشہ بالواسطہ ہوتا ہے بلاواسطہ نہیں ہوتا۔ بلاواسطہ کون سا علم ہوتا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ وہ علم حضوری ہوتا ہے۔ انہوں نے فرق کیا کیا؟ کہتے ہیں کہ صورتِ شے کا ذہن میں آجانا علم حصولی ہے' اور وہی شے آپ کے اندر آجائے یہ علم حضوری ہے۔ یعنی وہ صورت المعلوم نہ آئے بلکہ معلوم خود حاضر ہوجائے' یہ علم حضوری ہے۔ اس کی مثال دیتے ہیں کہ انسان کا اپنے بارے میں علم۔ انسان کا اپنے جذبات' نفرت' کراہیت' شجاعت' محبت وغیرہ کا جو علم انسان کو حاصل ہوتا ہے کیا وہ کسی خارجی صورت کے نتیجے میں یا کسی واسطے کے نتیجے میں حاصل ہو رہا ہوتا ہے' یا بلاواسطہ حاصل ہوتا ہے؟ بلاواسطہ حاصل ہوتا ہے' اس کے درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ انسان اپنے بارے میں جو کچھ جانتا ہے اس سے جو علم حاصل ہوا ہے وہ علم حضوری ہے اور خارج میں جو کچھ جانتا ہے وہ علم حصولی ہے۔ علم حضوری کا درجہ بلند ہوتا ہے اس لیے کہ یہاں واسطہ نہیں ہے۔ علم حصولی میں واسطہ ہے۔ جیسے ہم سند حدیث کو دیکھتے ہیں کہ جہاں واسطے کم ہوتے جاتے ہیں وہ سند عالی ہوجاتی ہے۔ یہاں بھی وہ کہتے ہیں کہ جتنا واسطہ عالم اور معلوم میں کم ہوتا چلا جائے گا اتنا ہی علم بڑھتا چلا جائے گا۔

یہ جو علم کی دو اقسام ہیں: علم حصولی اور علم حضوری' کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم کو اس میں سے کسی قسم میں رکھا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم حصولی ہے یا حضوری ہے؟ ہمارے علماء نے کہا کہ نہیں! علم حصولی تو کسی صورت میں بھی نہیں ہے' کیونکہ علم حصولی کا خلاصہ ہم نے یہ بیان کیا کہ ہم واسطے کے ذریعے جانتے ہیں' بغیر واسطے کے نہیں جانتے' تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم کسی واسطے کا محتاج نہیں ہوتا۔ علم حصولی میں گلاس کا علم حاصل کرنے کے لیے ایک اس کی دماغی صورت ہے جو میرے ذہن میں واقع ہوتی ہے' تو میں اس واسطے سے اس کا علم حاصل کر رہا ہوتا ہوں۔ کیا اللہ کا علم کسی واسطے کا محتاج ہے کہ وہ بھی دیکھ کر' سن کر' ہاتھ لگا کر' ذہن میں ایک صورت بنا کر' پھر اس شے کا علم حاصل کرے گا؟ نہیں! کیونکہ اللہ کا علم حصولی نہیں ہے۔

کیا اللہ کا علم حضوری ہے؟

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کا علم حضوری ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک لحاظ سے تو کہہ سکتے ہیں لیکن علم حضوری کے بھی کچھ مسائل ہوتے ہیں۔ علم حضوری میں اس علم کا نتیجہ فوری طور پر مترتب ہوجاتا ہے۔ جیسے میں کہتا ہوں کہ گلاس کا علم حاصل کرلیا تو ضروری نہیں کہ اس علم کے حاصل کرنے سے میرے نفس میں کوئی تبدیلی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن جیسے ہی مجھے اپنی محبت اور کراہیت کا علم ہو رہا ہے یعنی محبت ہو رہی ہے اور کراہیت پیدا ہو رہی ہے' نفس میں فوری طور پر اس کے کچھ اثرات ہو رہے ہیں۔ یعنی علم حضوری میں اپنے نفس کے بارے میں جن جن چیزوں کو جان رہا ہوں اس کے نتیجے میں میرا نفس اس سے متاثر ہو رہا ہے اور میرے اندر محبت پیدا ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو کسی شے سے متاثر بھی نہیں ہوتے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر کوئی شے مؤثر بھی

نہیں ہوتی ۔اس معنیٰ میں اللہ کا علم حضوری بھی نہیں ہے‘ لیکن اللہ کے ہاں تمام معلومات حاضر تو ہیں نا بغیر کسی واسطے کے ۔اس لحاظ سے اللہ کا علم ایک نوع کا حضوری بھی ہے‘ لیکن اس سے ہمیں پتا یہ چلا کہ جو انسانی علم کی اقسام ہیں‘ یا یہ جو دو تقسیمیں کی گئی ہیں: علم حصولی اور علم حضوری‘ اللہ تعالیٰ کا علم ان تقسیمات سے بھی ماوراء ہے ۔ ہوسکتا ہے یہ بات آپ کو خشک لگ رہی ہو لیکن سمجھنے کے لیے ضروری تھا‘ تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہم علم کیسے حاصل کرتے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس طرح علم حاصل نہیں کرتے کیونکہ وہاں حصول ہے ہی نہیں ۔ اللہ کے ہاں علم حاصل تو نہیں ہوتا‘ اللہ کے ہاں تو ہر شے ہر آن ظاہر ہے ۔

اس میں ایک اشکال یہ ہوسکتا تھا کہ اگر اللہ کا علم حضوری ہوگا تو گویا تمام مخلوقات اللہ میں حاضر ہیں‘ یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے ۔ یقیناً یہ وحدت الوجود کی طرف ایک رخ بنے گا‘ لیکن چونکہ علم حضوری میں معلوم خود اندر ہوتا ہے‘ اندر ہونے کی وجہ سے واسطہ نہیں ہوتا ۔کیا نعوذ باللہ! اللہ کا علم حضوری مخلوقات کا علم حضوری ہے؟ تو پھر مخلوقات تو خود (نعوذ باللہ) وجود الٰہی میں واقع ہوئیں ۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کا علم تمہاری تقسیمات میں کہیں داخل نہیں ہے‘ اللہ کا علم اس سے ماوراء ہے ۔ لہٰذا اللہ کے علم کو نہ تم حصولی کہہ سکتے ہو اور نہ ہر اعتبار سے علم حضوری کہہ سکتے ہو ۔علم حصولی اور علم حضوری کا فرق کرنے کے لیے کسی نے جدید مثال دی کہ آپ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں‘ آپ کو سینے میں یا کہیں بھی درد ہو رہا ہے ۔آپ کا درد کا علم‘ علم حضوری ہوتا ہے اور ڈاکٹر کو جو آپ کے درد کا علم حاصل ہوتا ہے وہ علم حصولی ہوتا ہے ۔ کیونکہ ڈاکٹر الفاظ کے واسطے سے یا کسی اور شے کے واسطے سے آپ کے درد کا علم حاصل کرے گا ۔لیکن آپ کو اپنے درد کا علم کسی واسطے سے حاصل نہیں ہو رہا‘ وہ آپ کے اندر پایا جاتا ہے ۔ بہرحال علم حصولی اور علم حضوری میں اس مثال سے آپ فرق واضح کر سکتے ہیں ۔ان دونوں کے فرق میں متکلمین اور مناطقہ نے دس پندرہ فروق بیان کیے ہیں کہ علم حصولی اور علم حضوری میں کیا فرق ہوتا ہے ۔ یہاں بحث سے متعلق جو فرق تھا وہ میں نے بیان کر دیا کہ علم حصولی پر اثر بھی فوری مترتب ہو رہا ہوتا ہے‘ البتہ علم حضوری پر اثر مترتب ہونا ضروری نہیں ہے ۔ بہرحال اب تک کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا علم محیط ہے‘ شامل ہے‘ تمام ممکنات‘ واجبات اور مستحیلات سے متعلق ہے ۔اور انسانی نوع کا علم نہیں ہے اور انسانی علم کی جتنی بھی تقسیمات ہیں ان میں سے کوئی تقسیم اللہ کے علم پر وارد نہیں ہوسکتی ۔

علم سابق اور ازلی کا مسئلہ

یہ بات جان لینے کے بعد اگلی بات یہ ہے کہ علم کے حوالے سے ہماری تاریخ میں کیا اشکالات پیدا ہوئے؟ ہماری تاریخ میں دو گروہ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم شامل کو کچھ وجوہات کی بنیاد پر ماننے سے انکار کیا ۔علم شامل سے مراد ہے جو محیط ہے‘ یعنی ہر شے کا علم ۔ایک گروہ کو ہم کہتے ہیں: قدریہ ۔قدریہ اگرچہ معتزلہ کو بھی کہا جاتا ہے‘ لیکن معتزلہ اللہ کے علم ازلی‘ علم شامل‘ علم محیط واسع کو مانتے ہیں ۔علم واسع کی اصطلاح قرآن مجید میں ہے: ﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ (المؤمن:۷) اسی طرح ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

عَلِيْمٌ﴾ (النور:۳۲) یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات ہیں۔قدریہ کو کہتے ہیں قدریہ اول یا اوائل۔قدریہ اوائل جو بالکل ابتداء میں صحابہ کے زمانے میں پیدا ہو گئے تھے۔اللہ کے رسول ﷺ سے بعض مرفوع روایات بھی نقل کی جاتی ہیں۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے: ((القدرية مجوس هذا الامة)) (سنن ابی داؤد) ''قدریہ اس اُمّت کے مجوسی (دوالٰہ کو ماننے والے) ہیں۔'' اور صحابہ نے بھی اس مسئلے پر کلام کیا۔یعنی یہ مسئلہ پہلی صدی کا ہے۔قدریہ کا دعویٰ تھا: لا قدر و الامر انف۔ ''قدر کوئی نہیں ہے اور معاملے کی ابتدا ابھی ہو رہی ہے۔'' یہاں قدر سے مراد اللہ کا علم سابق ہے۔یعنی اس وقت جو بھی معاملہ دنیا میں ہو رہا ہے یہ پہلے سے طے شدہ علم الٰہی میں نہیں ہے بلکہ اس کی ابتدا انسانی افعال سے ہو رہی ہوتی ہے۔ ''انف'' کسی شے کی ابتداء کو کہتے ہیں۔جیسے ہم نحو میں پڑھتے ہیں کہ یہ واؤ مستانفہ ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے' تو وہ بھی انف ہے۔یعنی اس جملے کا پیچھے سے تعلق نہیں ہے۔آپ اس کو نحو سے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جملہ مستانفہ وہ ہے جس کا نحوی اعتبار سے ماقبل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔یہاں جب وہ ''الامر انف'' کہہ رہے ہیں تو کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ جو دنیا میں معاملات اور حوادث ہو رہے ہیں اس کا پہلے سے علم الٰہی سے' ازلی سے' سابق سے' محیط سے' شامل سے کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال یہ قدریہ کا دعویٰ تھا' اور جو یہ دعویٰ رکھتے تھے ان کی تکفیر کی گئی۔صحابہ اور ائمہ دین سے اقوال مروی ہیں کہ انہوں نے تو طے شدہ بات کا انکار کر دیا۔ہم قرآن کی آیات سے دیکھ چکے کہ واضح طور پر سبق (پہلے سے علم) کا اثبات ہے۔جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ (الحدید)

''نہیں پڑتی کوئی پڑنے والی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری اپنی جانوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے' اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

یہ سب اللہ کے حق میں آسان ہے۔پہلے سے ہر شے کتابِ مبین میں درج ہے۔قدریہ نے قدر کا جو انکار کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ جو ابتدائی کلامی مسئلے پیدا ہوئے اور بہت بڑا مسئلہ جو انسانی دماغ کو مشغول کرتا چلا آیا وہ ہے ''جبر وقدر کا مسئلہ''۔اس مسئلہ میں جبر سے نکلنے کے لیے انہوں نے علم سابق کا انکار کر دیا' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر اللہ کے علم سابق' علم ازلی کو بھی مان لیا جائے تو پھر انسان اپنے اعمال میں مجبور ہی ٹھہرتا ہے' لہٰذا اس سے نکلنے کے لیے علم سابق' علم ازلی کا انکار کر دو۔جبکہ معتزلہ نے علم سابق کا انکار نہیں کیا۔ان کو یہ لوگ کہتے تھے کہ تم اس مسئلے سے جان نہیں چھڑا سکتے۔یعنی اگر تم یہ کہتے ہو کہ ہم نے خلق افعال کو انسان کی طرف منسوب کر دیا تو وہ کہتے تھے چاہے منسوب کروا دو لیکن اگر علم سابق کو مانو گے تو جبر پھر بھی رہے گا۔لہٰذا اگر جبر سے نکلنا ہے اور اپنے آپ کو زیادہ مختار اور آزاد ثابت کرنا ہے تو پھر علم سابق کا انکار کرو۔بہرحال یہ وہ لوگ تھے جن کو یہ مسئلہ پیش آیا کہ جبر وقدر کے مسئلے میں اپنی عقل سے گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی اور انہیں یہی سمجھ میں آیا کہ یہ گتھیاں اسی وقت سلجھ

سکتی ہیں کہ ہم ایسی صفت کا انکار کر دیں جو خود اللہ نے بتائی ہے۔

علم خداوندی جزئیات اور کلیات دونوں کو محیط ہے

ایک دوسرا گروہ بعد میں پیدا ہوا۔ قدریہ نے جبر و قدر سے نکلنے کے لیے یہ سلسلہ نکالا تھا' جبکہ یہ لوگ کچھ اپنے فلسفیانہ دلائل رکھتے تھے' جن کی بنیاد پر ان کا خیال یہ بنا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جزئیات کا علم نہ ہونا اُس کی شان ہے۔ اس گروہ کو ہم اپنی تاریخ میں ''حکماء'' کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کو فلاسفہ بھی کہا جاتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو فلاسفہ نہیں بلکہ حکماء کہتے تھے۔ جیسے ابو یعقوب الکندی' ابن سینا (جن کو شیخ الرئیس کہا جاتا ہے)' الفارابی وغیرہ۔ ان لوگوں کے ہاں مشترکہ بات یہ ہے کہ صفت علم میں جزئیات کا انکار۔ امام غزالیؒ نے جن بنیادوں پر فلاسفہ کی تکفیر کی ہے' بلکہ بعد میں آنے والے متکلّمین نے بھی ان کی تکفیر کی ہے تو ان تین وجوہات میں سے ایک وجہ تکفیر یہی ہے کہ انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم شامل کا انکار کیا ہے' وہ علم جو جزئیات پر محیط ہے۔ جب امام غزالیؒ نے ''تہافۃ الفلاسفہ'' لکھی اور بعد میں ابن رشد تشریف لائے اور انہوں نے اپنے خیال میں امام غزالیؒ کا ردّ کیا اور ''تہافۃ التہافۃ'' کتاب لکھی تو بہت کوشش کی کہ کسی طرح فلاسفہ کے اقوال کو شریعت کے مطابق ثابت کر کے دکھا دیا جائے۔ لیکن جاننے والے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ یعنی ابن رشد کا بھی بنیادی مقصد یہ نہیں تھا کہ قرآن سے کچھ ثابت ہو رہا ہے تو اس کو ثابت کیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ ان بڑے فلاسفہ کے اقوال اور شریعت کے مابین کسی نہ کسی طریقے پر دور دراز کی تاویلات کر کے ایک نوع کی تطبیق کر دی جائے۔ اسی لیے ہمارے متکلّمین ان فلاسفہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کے ہاں صحیح معنی میں نہ ارادہ ہے نہ علم ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کے لیے جو دو صفات بہت ضروری ہیں یعنی صفت ارادہ اور صفت علم وہاں دونوں نہیں ہیں۔ لہٰذا متکلّمین کے ہاں جملہ مشہور ہے: اجہل الخلق باللہ الفلاسفہ۔ یعنی اللہ کو جاننے میں اجہل الخلق یہی لوگ ہیں۔ جو اللہ کو نہیں جانتے۔ اگرچہ بہت بڑے نام ہیں' ہم سوچ نہیں سکتے۔ یعنی ابن سینا اور فارابی جیسے لوگ' جس طرح ان کو زبانوں اور علوم پر عبور تھا وہ شاید نا قابل یقین حد تک تھا۔ ہمارے متکلّمین نے ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر وحی کی روشنی صحیح طریقے پر حاصل نہ کی جائے تو بڑے بڑے دماغ ہی بڑی بڑی غلطیاں کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَمَآ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ سَمۡعُہُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُہُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُہُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ کَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَحَاقَ بِہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾

یعنی جب وہ لوگ اللہ کی آیات کے انکار پر آ گئے اور انہوں نے استہزاء کیا تو انہیں ان کی سماعت' بصارت اور فواد نے نفع نہیں دیا۔ اگرچہ سماعت' بصارت اور فواد بھی تھے لیکن چونکہ اللہ کی آیات سے ایک نوع کی دشمنی اور عداوت قائم کر لی تو اس کے نتیجے میں ان کی ساری صلاحیتیں گمراہی ہی میں اضافہ کا باعث بن گئیں۔ جیسے قرآن مجید ہدایت ہے لیکن فرمایا کہ یہ ظالموں کے خسارے میں ہی اضافہ کرتا ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾﴾

(بنی اسرائیل)

''اور ہم قرآن سے وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو شفا اور رحمت ہے اہلِ ایمان کے حق میں' لیکن یہ ظالموں کو نہیں بڑھاتا مگر خسارے ہی میں۔''

یعنی جو مانے کہ جو اللہ نے کہا ہے وہ برحق ہے اور ہم نے خوامخواہ اللہ کے کلام کو غیروں کے کلام سے تطبیق دینے کے لیے اسے مروڑا نہیں ہے۔ اگر یہ نیت نہیں ہے تو پھر مسئلہ نہیں ہے' لیکن ان کے ہاں نیت تھی کہ کسی بھی طریقے پر دونوں میں تطبیق پیدا کر کے دکھا دی جائے۔

فلاسفہ کا مسئلہ

ابن رشد نے اپنی کتاب کے مقدمے میں عبارت اس طرح شروع کی: الحمد للّٰہ الذی خلق ارسطو۔ حکماء ارسطو کو معلم اول کہتے تھے اور معلم ثانی ہمارے فارابی کہلاتے ہیں' کیونکہ فارابی نے خصوصی طور پر منطقی علوم کی تنقیح وتہذیب کی ہے اور ترجمے بھی کیے ہیں۔ یعنی منطق کو اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ فارابی نے داخل کیا ہے۔ بہرحال جہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تعریف اس بات پر ہو کہ اُس نے ارسطو جیسا دماغ پیدا کر دیا' جہاں یہ مرعوبیت اور دبدبہ ہو وہاں قرآنی آیات' احادیث یا وحی کو ان اقوال سے موافقت دکھانے کے لیے تروڑا مروڑا جاتا ہے۔ بہرحال آپ دیکھیں گے کہ فلاسفہ کے اندر جو خناس ہوتا ہے وہ بالآخر ظاہر ہو جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ سورۂ غافر کی آیت ۸۳ کی تفسیر میں نے جہاں بھی دیکھی ہے وہاں یہ قول ضرور آتا ہے کہ یہ فلاسفہ کے متعلق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾

''جب ان کے پاس ان کے رسول آ گئے ہماری واضح نشانیاں لے کر تو وہ اپنے علم پر اترا گئے۔''

جہاں ''فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ'' کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہاں ہدایت حاصل نہیں ہوتی' چاہے دماغ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' چاہے صلاحیتیں کتنی ہی کیوں نہ ہوں' چاہے انسان منطق میں معلم ثانی ہی بن جائے' چاہے ستر لغات ہی کیوں نہ جانتا ہو۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فارابی ستر زبانیں جانتے تھے اور ہر فن پر ایک عجیب وغریب قسم کی مہارت تھی۔ لیکن ﴿فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾ یعنی اپنے علم پر اترانا غلط ہے۔ آپ کے سامنے وحی آئے تو آپ نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہے' وہاں اپنی عقل کو جھکا دینا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو معلم اول ماننا ہے۔ معلّم اوّل یا ثانی اللہ کے نبی ﷺ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

''درحقیقت اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے اہلِ ایمان پر' جب اُن میں اٹھایا ایک رسولؐ۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا سب سے بڑا احسان محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمانا ہے۔ لیکن فلاسفہ کے ہاں ''فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ'' کی کیفیت ہے' وہ انفرادیت (uniqeness) چاہتے ہیں۔ یعنی اگر آپ ابن رشد' فارابی اور ابن سینا وغیرہ کو پڑھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم عوام الناس سے کچھ الگ ہیں' ہماری species الگ ہے' ہم خاص لوگ ہیں۔ عام لوگ جو نماز' روزہ کر رہے ہوتے ہیں اور اللہ کو اس طریقے پر جانتے ہیں وہ عوام الناس کے لیے ہے۔ لہٰذا ابن رشد فرماتے ہیں کہ شریعت بھی عوام الناس کو مخاطب کرتی ہے اور ان کو ایسی باتیں بتادی جاتی ہیں جو خلافِ حقیقت ہوتی ہیں' کیونکہ عوام الناس سمجھ نہیں سکتے۔ یعنی ہم تو پڑھے لکھے لوگ ہیں' ہم تو سمجھ سکتے ہیں' ہمارے پاس تو دماغ ہے' لہٰذا عوام الناس کو وہی بتادینا چاہیے جو شریعت نے بتادیا اور ان کو اسی پر لگائے رکھو۔ ہم خاص لوگ ہیں' ہمارے لیے یہ احکام نہیں ہیں یا ہمارے لیے یہ عقائد نہیں ہیں۔ بہرحال یہ اس طرح کے لوگ تھے۔ میں نے کسی متکلم (شاید سعدالدین تفتازانی) کا قول پڑھا تھا: اجهل خلق الله بالله هو الفلاسفه۔ ''اللہ کی مخلوق میں اللہ کو جاننے کے اعتبار سے سب سے جاہل فلاسفہ ہیں''۔ لہٰذا یہ ذہن میں رکھیے کہ دین اللہ کی عبادت ہے۔ الگ سے اپنی کوئی دکان بنالینا اور اپنی انفرادیت (uniqueness) قائم کرلینا کہ چلو میں نئے افکار نکال لیتا ہوں تو لوگ پیچھے چلنا شروع ہوجائیں گے' یہ دین نہیں ہے۔

آج کل یہی چل رہا ہے کہ آپ وہی باتیں کرتے چلے جائیں جو سب کرتے ہیں لیکن ایک دن کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیں تو بدنامی تو ہوگی لیکن بدنامی میں نام تو ہوگا۔ بہرحال لوگ نئی باتیں اور نئے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں' لیکن دین یہ نہیں ہے' بلکہ دین اللہ تعالیٰ سے سچے تعلق کا نام ہے اور اس طریقے پر کھڑے ہوجانا جس طریقے پر دین کو سمجھا گیا ہے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ' صحابہ' تابعین اور تبع تابعین سے ہوتا ہوا تواتر کے ساتھ جو دین کا فہم پہنچا ہے اس فہم کے سامنے سرِتسلیم خم کردینا۔ البتہ اللہ سے سچے تعلق میں uniqueness پیدا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس میں ہر شخص واقعی ایک انفرادی شان پیدا کرسکتا ہے۔ لوگوں میں انفرادی شان پیدا نہیں کرنی کہ میں لوگوں میں unique ہوجاؤں اور لوگ مجھے کچھ سمجھ لیں۔ یہ بالکل فضول بات ہے۔ موت کے وقت آنکھ بند ہوتے ہی یہ سب خیالات ہوا ہوجائیں گے اور جو شے کام آنے والی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق ہے۔ ہم بھی کبھی کبھی فلاسفہ اور ان دماغوں کا ایسا بیان کردیتے ہیں جس سے سامنے والوں پر رعب و دبدبہ قائم ہوجاتا ہے کہ یہ بہت بڑے لوگ تھے۔ لیکن ساتھ یہ بھی بتائیں کہ ہمارے متکلمین نے ان کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ یہ '' اجهل الخلق بالله ''یعنی اللہ کو جاننے میں سب سے زیادہ جاہل بھی تھے۔ یقیناً اللہ کو سب سے بڑھ کر جاننے والے انبیاء کرام علیہم السلام ہوتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا: ((اِنِّی اَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ)) (صحیح البخاری) ''میں تم میں سے اللہ کو سب سے بڑھ کر جانتا ہوں''۔ لہٰذا اللہ کو جو سب سے زیادہ جانتا ہے وہ اللہ کا رسول ہے (علیه الصلوٰة والسلام)۔

فلاسفہ کے ہاں انکارِ علم کی وجہ

فلاسفہ نے علم کا انکار کیوں کیا؟ اس کی ایک وجہ وہی ہے جو ہم پیچھے سے جوڑ کر دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے ہم نے دیکھا تھا کہ ان کے ہاں اللہ تعالیٰ فاعل مختار نہیں ہے جو ارادے سے کام کر رہا ہو' بلکہ اللہ تعالیٰ موجب بالذات ہے۔ یعنی وہاں ارادہ نہیں ہے بلکہ اللہ ایک علت اولیٰ ہے جس سے معلول نے ہونا ہی ہونا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کائنات پیدا نہیں کی بلکہ اللہ سے صادر ہوئی ہے تو جس شے سے کوئی شے صادر ہو رہی ہوتی ہے یعنی مصدور' اسے اپنے سے صادر ہونے والی تمام اشیاء کا علم ضروری نہیں ہے' لہٰذا جہاں فاعل مختار ہونے کی نفی کی ہے وہاں علم کی نفی بھی ہو جاتی ہے' کیونکہ جو فاعل مختار ہوگا وہ اپنی مراد اور اپنی مخلوق کو جانتا ہے۔ اور جہاں سے چیزیں صادر ہو رہی ہیں علت اولیٰ کے تصور پر اور جہاں سے فیضان ہو رہا ہے بغیر ارادے کے تو وہاں علم کی شرط نہیں ہے۔ یہ ہے ایک طریقہ جس پر ہمارے علماء نے کہا کہ اگر ہم فلاسفہ کے مذہب کو سمجھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے علم کا انکار کیوں کیا۔ پھر انہوں نے اپنے اس انکار کو justify کرنے کے لیے بہت سے دلائل دیے ہیں۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ تغیرات سے ماوراء ہے۔ اے مسلمانو! تم مانتے ہو یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ متغیر تو نہیں ہے' لیکن معلومات تو متغیر ہیں۔ یعنی میں اگر یہاں بیٹھا ہوا ہوں اور اُٹھ کر وہاں چلا گیا تو میں متغیر ہوں۔ میں اللہ کا معلوم ہوں تو میں متغیر ہو گیا۔ میں یہاں سے وہاں چلا گیا۔ تو یہ کیسا علم ہے کہ اگر معلوم میں تغیر ہو تو وہاں تغیر نہ ہو۔ یعنی اللہ کا یہ جاننا کہ میں اس وقت کرسی پر بیٹھا ہوں اور اس کے بعد میں صوفے پر جا کر بیٹھ گیا تو دونوں علم ایک جیسے تو نہیں ہیں۔ اللہ اس وقت جانتا ہے کہ میں کرسی پر بیٹھا ہوں۔ اس کے بعد جب میں وہاں پر جا کر بیٹھ جاؤں گا تو اب وہ جان رہا ہوگا کہ میں اس وقت صوفے پر بیٹھا ہوا ہوں۔ لہٰذا یہ دونوں علم ایک دوسرے سے مختلف ہیں یا نہیں؟ ہاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تو جب تغیر معلوم میں ہو رہا ہے تو کیسے وہاں تغیر نہیں ہو رہا؟ لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ ہر جزو کو جانے گا تو جزئیات کائنات میں مستقل متغیر ہیں تو کیسے تم مانو گے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات تغیر اور حوادث سے ماوراء ہے؟ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے' لہٰذا ہم جزئیات کے علم کو سابق نہیں مانتے۔

معلوم تابع علم خداوندی ہے

اس کے جواب میں ہمارے متکلمین نے کہا کہ تم دماغ تو بہت بڑے ہو لیکن تم نے یہاں قیاس الغائب علی الشاھد کیا ہے۔ تم نے غائب کو شاہد پر یعنی اپنے سامنے جو تم دیکھ رہے ہو اُسی پر اللہ کو قیاس کر لیا ہے۔ کیونکہ تم اپنے بارے میں یہ جانتے ہو کہ معلوم بدل جائے گا تو میرا علم بھی بدل جائے گا' کیونکہ تمہارا علم زمانی ہوتا ہے۔ تم ایک زمان میں ہو' لہٰذا جو معلوم شے ہے وہ جب متغیّر ہے تو وہ ایک زمان میں متغیّر ہوتی ہے جو پہلے متغیّر نہیں تھی' لہٰذا جب تمہارا علم بھی زمانی ہے تو وہ معلوم کے بدلنے سے متغیّر ہو جائے گا۔ لیکن جب ہم اللہ کے بارے میں جان چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ زمان ومکان سے ماوراء ہے' لہٰذا اللہ کے علم کو یوں نہ سمجھو کہ جس طرح زمان

میں تمہارا علم ہے کہ ایک شے پہلے ہے ایک شے بعد میں ہے' بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ زمان ومکان سے ماورا ہے' وہاں تغیر نہیں۔ انہوں نے سمجھانے کے لیے اس کی ایک مثال دی۔ وہ کہتے ہیں کہ زمان ومکان میں ہوتے ہوئے بھی زاویہ نگاہ بدلنے سے علم بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تم اگر کسی چھت پر کھڑے ہو اور تمہارے نیچے تین آدمی گزر رہے ہیں اور ایک شخص کمرے کی کھڑکی کے سوراخ سے نیچے سے دیکھ رہا ہے تو اس کے سامنے پہلا ایک آدمی آئے گا' وہ اس کے لیے اس وقت حاضر ہے۔ پھر وہ گزر جائے گا تو وہ اس کے لیے ماضی ہو جائے گا۔ پھر دوسرا آجائے گا' وہ اس وقت حاضر ہے۔ وہ گزر جائے گا تو وہ ماضی ہے۔ پھر تیسرا آئے گا جو اس سے پہلے مستقبل تھا' وہ حال بنے گا اور پھر وہ مستقبل ہو جائے گا۔ تو زاویہ نگاہ مکانی اتنا سا ہونے کی وجہ سے تین آدمیوں میں سے ایک اس کے لیے مستقبل ہے' ایک حاضر ہے اور ایک ماضی ہے۔ اور تم جو چھت سے نیچے دیکھ رہے ہو تو تمہارے لیے تینوں اس وقت حاضر ہیں۔ تم تینوں کو ایک ساتھ چلتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔ یہ مثال صرف تقریب کے لیے ہے کہ صرف زاویہ مکان بدل جانے سے وہی شے جو نیچے والے شخص کے لیے حاضر' ماضی اور مستقبل تھا وہ تمہارے لیے اس وقت حاضر ہے۔ تم ان کو بیک وقت دیکھ رہے ہو۔ نہ پہلا شخص تمہارے لیے ماضی ہے' نہ دوسرا حاضر ہے' نہ تیسرا مستقبل ہے۔ اور جو ہستی زمان ومکان سب سے ماوراء ہوگی اس کے لیے یہ تصور کہ ایک شے پہلے ہے اور ایک بعد میں اور اس کا علم بدلتا چلا جا رہا ہے' غلط ہے۔ وہاں ان تمام تغیرات سے ایک ماوریت اور تنزیہ ہے۔

ہمارا علم کیا ہے؟ ہمارا علم معلوم کے مطابق ہو تو ٹھیک ہے' معلوم کے مطابق نہیں ہے تو ٹھیک نہیں ہے۔ یعنی ہمارا علم معلوم کے تابع ہوتا ہے' اللہ کے ہاں معلوم اس کے علم کے تابع ہے۔ لہٰذا وہاں معلوم نے ہر وقت اس طرح ہونا ہوتا ہے جس طرح اللہ کا علم ہے۔ لہٰذا وہاں ایسا نہیں ہے کہ معلوم بدل جائے تو علم بدل جاتا ہے۔ وہاں معلوم علم کے تابع ہوتا ہے۔ لہٰذا علم کے موافق معلوم بدلتا ہے' معلوم کے موافق علم نہیں بدلتا۔ بہرحال یہ صفت علم ایسی ہے کہ اس پر مزید گفتگو ہوگی کہ اس کے نتیجے میں ہمارے اندر عبودیت کے کیا احوال پیدا ہونے چاہئیں۔ ❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 90 روپے اشاعت عام: 60 روپے

سائنسی علوم کی ایک مثالی
اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت (۴)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

سائنس اور خُدا کے افتراق کے مہلک نتائج

عیسائی مغرب کا خُدا کے عقیدہ کو سائنس سے خارج کر دینا عالَمِ انسانیت کا ایک نہایت ہی المناک حادثہ ہے جو بظاہر نہایت ہی خاموش اور پُرامن اور بے ضرر تھا۔ لیکن نوعِ انسانی کی بے شمار قدیم وجدید مصیبتیں اور بدبختیاں اور بربادیاں اور تباہیاں ایسی ہیں کہ اگر ان کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو ان کا آخری اور بنیادی سبب یہی حادثہ نکلتا ہے۔ اسی کی وجہ سے نوعِ انسانی ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے اور ہر ٹکڑے نے اپنا نسلی' یا لسانی' یا ثقافتی یا جغرافیائی بُت پوجنے کے لیے کھڑا کر لیا ہے۔ اس کی وجہ سے قوموں کی زندگی باہمی رقابتوں اور مسابقتوں کا اکھاڑا بنی ہوئی ہے۔ اسی کی وجہ سے استعمار پرستی اور شہنشاہیت اور ان کی ملحقہ برائیاں انسانوں پر مسلّط ہوتی رہی ہیں۔ اس کی وجہ سے انسانیت دو ہولناک عالمگیر جنگوں کی تباہ کاریوں کا سامنا کر چکی ہے اور تیسری عالمگیر جنگ کے خطرہ سے دوچار ہے۔ اسی کی وجہ سے اشتراکیت کا خوفناک فتنہ کھڑا ہوا ہے۔ اسی کی وجہ سے دنیا بھر میں جنسی بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جرم پسندی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اسی کی وجہ سے دنیا بھر کے ملکوں میں خودکشی کرنے والوں اور دماغی ہسپتالوں میں داخل ہونے والوں کی تعداد روز افزوں ترقی پر ہے۔ اسی نے علم کی تقدیس کو ختم کر کے اسے محض مادّی منفعت طلبی کا ایک آلہ بنا دیا ہے۔ اسی کی وجہ سے طالب علموں کے دلوں سے پروفیسروں اور استادوں کا احترام رخصت ہو گیا ہے اور تعلیمی اداروں کے ضبط اور نظم کا سلسلہ ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ اسی کی وجہ سے مادّی اور حیاتیاتی سائنسوں کی ترقی کی رفتار متواتر سست ہوتی گئی ہے اور نفسیاتی اور انسانی سائنسوں کی ترقی مدّت سے رُکی ہوئی پڑی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے مذاہب کے درمیان کی خلیجیں سمٹنے کی بجائے اور وسیع ہوتی جا رہی ہیں۔

مسلمانوں کی افسوس ناک غلطی:

عیسائی مغرب کے سائنس دانوں کی کورانہ تقلید اور اسلامی فلسفۂ علم کی ناقدردانی

یورپ کی علمی دنیا عیسائیت کے نقائص کی وجہ سے خُدا کے عقیدہ کے خلاف علمی تعصب کی جس بدبختی کا شکار ہوئی ہے وہ مسلمانوں کے حصّہ میں نہ آسکتی تھی کیونکہ اسلام ان نقائص سے پاک ہے' لیکن ہم نے اسلام کی

تعلیمات کو اور اپنے آبائے اوّلین کی روایات کو بھلا کر اور یورپ کی کورانہ تقلید کو اپنا کر اسی سے حصّہ لیا ہے۔ ؎

اے بعشقِ دیگراں دل باختہ　　آبروئے خویش را نشناختہ

اسلام کی رُو سے خدا کا عقیدہ سائنس کی کلید اور بنیاد ہے!

اسلام میں خُدا کے عقیدے کا کوئی اختلاف سائنس سے نہیں' بلکہ اسلام کی رُو سے خُدا کا عقیدہ سائنس کی کلید ہے جس کے بغیر سائنس پوری طرح سائنس نہیں بن سکتی اور اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ اسلام انسان اور کائنات کا علم ہے۔ خُدا کا عقیدہ جو اسلام کی روح ہے' کائنات کی روح بھی ہے۔

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ ﴾ (النور :۳۵) ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔''

اور جس طرح سے وہ کائنات کی روح ہے اسی طرح سے وہ علم کائنات یا سائنس کی روح بھی ہے اور کائنات میں کائنات کے تینوں طبقے مادّہ (matter)' جاندار (life) اور نفسِ انسانی (mind) شامل ہیں۔ خُدا وہ قانونِ قوانین ہے جو مادّہ' جاندار اور انسان تینوں پر حاوی ہے اور جس کے سامنے تینوں سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں' کوئی خوشی سے اور کوئی بادلِ ناخواستہ۔ مادّہ اور جاندار اور مؤمنین کی جماعت تو اس قانون پر اپنی رضا و رغبت سے عمل کرتے ہیں لیکن منکرینِ خُدا اس بات پر بجبر و اکراہ عمل پیرا ہیں' کیونکہ جب وہ سچّے خُدا کو نہیں مانتے تو انہیں مجبوراً کسی جھوٹے خُدا کو خُدا ماننا پڑتا ہے اور پھر اس جھوٹے خُدا سے مایوس ہو کر اور دکھ اور نقصان اٹھا کر وہ زود یا بدیر سچّے خُدا کی طرف گھسٹتے ہوئے آتے ہیں۔ جو لوگ دینِ اسلام سے جس کی روح خُدا کا عقیدہ ہے' انحراف کرنا چاہتے ہیں خُدا ان کو تنبیہ کرتا ہے کہ مایوسی' دُکھ اور نقصان اٹھانے کے بغیر تم ایسا نہیں کر سکو گے اور پھر بھی آخر کار اُسی کی طرف ہانکے جاؤ گے' کیونکہ اسلام کی روح تو وہ قانون ہے جس پر عمل کرنے کے لیے کائنات کی ہر چیز طوعاً و کرھاً مجبور ہے۔ پھر اس انحراف سے تمہیں فائدہ کیا ہے؟

﴿ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ ﴾ (آلِ عمران)

''کیا وہ اللہ کے دین کو (جو سچّے خُدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی دعوت دیتا ہے) چھوڑ کر کسی اور دین کو اختیار کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ سچّے خُدا کے سامنے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز سرِ تسلیم جھکائے ہوئے ہے خوشی سے یا بادلِ ناخواستہ' اور (آخر کار) وہ (بھی جو بادلِ ناخواستہ اُس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں بخوشی) اس کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (پھر اب تمہیں اس انحراف سے کیا حاصل ہے!)''

اِس دور کے مسلمان سائنس دانوں اور فلسفیوں کا غلط نقطۂ نظر

آج اگر ہم کسی اپنے مسلمان بھائی سے جو کہیں سائنس یا فلسفہ کے پروفیسر ہوں' یہ کہیں کہ آپ مادّی' حیاتیاتی اور نفسیاتی سائنسوں میں ایسے نظریات کی تعلیم دے رہے ہیں یا ایسے نظریات کی بنا پر علمی تحقیقات کر رہے ہیں جو عقلی اور علمی لحاظ سے خدا کے عقیدہ کے ساتھ متصادم ہوتے ہیں یا اس کو نظر انداز کرتے ہیں تو ان کا جواب یہ

ہوتا ہے: ''صاحب! مَیں بھی آپ کی طرح مسلمان ہوں' لیکن سائنس اور فلسفہ مذہب سے الگ چیزیں ہیں' ان کو خُدا کے عقیدہ سے اور خُدا کے عقیدہ کو ان سے الگ رہنا چاہیے' یہاں تک کہ سائنس اور فلسفہ بالآخر ان کو ثابت کر دیں۔ سائنس مشاہدات کے بے لاگ نتائج پر اور فلسفہ غیر جانبدارانہ استدلال پر مبنی ہے۔ پہلے سے طے کیا ہوا اعتقاد ایک تعصب ہے جو علم کو رنگ دار اور اس کی صحت وصفائی کو داغ دار کر دیتا ہے۔ اگر ہم سائنس اور فلسفہ کی تحقیقات میں کسی عقیدہ سے آغاز کریں گے تو نہ ہماری سائنس سائنس رہے گی اور نہ ہمارا فلسفہ فلسفہ رہے گا۔ پھر یہ دونوں چیزیں مذہب ہی بن کر رہ جائیں گی۔ سائنس علت اور معلول کے پورے سلسلہ کو معلوم کرنا چاہتی ہے لیکن اگر آپ خُدا کے عقیدہ کو سائنس کی بنیاد بنا دیں گے تو پھر چونکہ خدا ہر معلول کی علّت ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے ہر معلول کی علّت کو پہلے ہی سے معلوم کر لیا ہے' لہٰذا آپ کو سائنسی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔''

حقیقتِ وجود اور حقیقتِ علم کے کسی عقیدہ کے پس منظر کے بغیر سائنس ناممکن ہے

لیکن یہ جواب از سرتا پا غلط ہے اور کئی مغالطوں سے پُر ہے۔ پہلا مغالطہ تو اس میں یہ ہے کہ سائنس یا فلسفہ کی کوئی ایسی صورت بھی ہوسکتی ہے جو کسی عقیدہ پر مبنی نہ ہو بلکہ عقیدہ کے لحاظ سے غیر جانبدار ہو۔ اُوپر مَیں نے یہ عرض کیا تھا کہ سائنس کسی فلسفیانہ پس منظر کی محتاج ہے اور ہمیشہ حقیقتِ کائنات اور حقیقتِ علم کے متعلق کسی اعتقاد کے گہوارہ میں پرورش پاتی ہے۔ کیا اس بات کے ثبوت کے طور پر یہ بات کافی نہیں کہ روس کی سائنس سرمایہ دار ممالک کی سائنس سے اور سرمایہ دار عیسائی ممالک کی سائنس روس کی سائنس سے مختلف ہے اور مختلف رکھی جاتی ہے۔ دونوں میں سے ہر فریق دوسرے کی سائنس کو غلط قرار دیتا ہے۔ ان کے مختلف ہونے کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ دونوں کے پس منظر کے نظریات' جن کے زیر اثر ان کی نشوونما ہوئی ہے' الگ الگ ہیں۔ دونوں فریق ایک ہی طرح کے مشاہدات سے مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں جو ان کے نظریات کے مطابق ہوتے ہیں' کیونکہ کوئی فریق اپنی انسانی فطرت کے بے پناہ قوانین کی وجہ سے اپنے نظریہ کے دائرہ سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ روس کی سائنس علی الاعلان اس عقیدہ سے آغاز کرتی ہے اور آخر تک اس پر قائم رہتی ہے کہ:

> ''حقیقتِ کائنات مادّی ہے اور اس قسم کی ہے کہ سائنسی حقائق سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اگر ہم دونوں کے اس تعلق کو مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو اس کی روشنی میں انجام دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج درست ہوں گے اور اگر ہم اس تعلق کو نہ مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو حقیقت کے مادّی تصوّر کی روشنی میں انجام نہ دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج غلط ہو کر رہ جائیں گے۔''

یہ عقیدہ ایک مذہب کا جزو ہے اور کوئی سائنسی حقیقت نہیں' کیونکہ سائنسی مشاہدہ یا تجربہ سے ثابت شدہ نہیں۔ اس مذہب کو روس والے جدلی مادیات (Dialectical Materialism) کا نام دیتے ہیں۔ سرمایہ دار عیسائی ملکوں کی سائنس اس بات کا اعتراف نہیں کرتی کہ وہ کسی عقیدہ سے آغاز کرتی ہے یا کسی عقیدہ پر مبنی ہے لیکن دراصل اس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ:

''حقیقتِ کائنات مادّی ہو یا روحانی یا کچھ اور، وہ اس قسم کی ہے کہ سائنسی حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں سوائے اِس کے جو کسی وقت خود سائنس ہی ثابت کر دے۔ لہٰذا اگر ہم دونوں کی اس موجودہ بے تعلقی کو مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو اس کی روشنی میں انجام دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج درست ہوں گے اور اگر ہم دونوں کی اس بے تعلقی کو نہ مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو حقیقت کے کسی تصوّر کی روشنی میں انجام دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج غلط ہو کر رہ جائیں گے۔''

یہ عقیدہ بھی ایک مذہب کا جزو ہے اور کوئی سائنسی حقیقت نہیں جو کسی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہو۔ زمانۂ حال کے مفکرین نے اس مذہب کو سائنٹزم (Scientism) کا نام دے کر دوسرے مذاہب سے ممیّز کیا ہے۔

مذہب سائنٹزم کا تضاد

مذہب سائنٹزم (Scientism) کا تضاد جو اسے معقولیت کے پایہ سے گرا دیتا ہے یہ ہے کہ اس کا پیرو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی سائنس کی مدد سے کسی وقت حقیقتِ کائنات کی پردہ کشائی کرے گا۔ حالانکہ اس کی سائنس خود حقیقتِ کائنات کے ایک تصوّر پر مبنی ہے اور جب تک وہ سائنٹزم کا معتقد ہے اس کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی اور وہ حقیقتِ کائنات کا تصوّر خود سائنٹزم ہے۔ کسی تصوّرِ حقیقت کی ضرورت ایک انسان کے لیے اس قدر فوری اور شدید اور ناگزیر ہے کہ کوئی سائنس دان ایک لمحہ کے لیے بھی اسے ملتوی نہیں کر سکتا چہ جائے کہ اسے اپنے سائنسی نتائج کی متوقع پختگی تک برسوں کے لیے اُٹھا رکھے۔ انسان اپنے تصوّرِ حقیقت کا براہِ راست مشاہدہ یا احساس کرتا ہے، اس کو ثابت نہیں کرتا۔ اس کی علمی تحقیق اس کے تصوّرِ حقیقت کو دریافت نہیں کرتی بلکہ اس کا تصوّرِ حقیقت اس کی علمی تحقیق کی راہ نمائی کرتا ہے۔

اسلام کی رُو سے سائنس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے:

''حقیقتِ کائنات روحانی ہے اور وہ اس قسم کی ہے کہ سائنسی حقائق سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اگر ہم دونوں کے اس تعلق کو مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو اس کی روشنی میں انجام دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج درست ہوں گے۔ اور اگر ہم اس تعلق کو نہ مانیں گے اور اپنی سائنسی تحقیق کو حقیقت کے روحانی تصوّر کی روشنی میں انجام نہ دیں گے تو ہمارے سائنسی نتائج غلط ہو کر رہ جائیں گے۔''

یہی وہ فلسفۂ سائنس ہے جس کی روشنی میں عہدِ قدیم کے مسلمانوں نے سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی۔

سائنس کے اسلامی اور اشتراکی فلسفوں میں فرق

ظاہر ہے کہ اسلامی فلسفۂ سائنس اور اشتراکی فلسفۂ سائنس میں صرف یہی ایک فرق ہے کہ اشتراکی فلسفۂ سائنس میں حقیقتِ کائنات مادّی ہے اور اسلامی فلسفۂ سائنس میں حقیقتِ کائنات روحانی ہے، ورنہ دونوں ایک ہیں۔ دونوں ببانگِ دہل اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ان کی سائنس ایک عقیدہ پر مبنی ہے۔ جب دنیا بھر میں سائنس دان اپنی تحقیقات کی بنیاد کسی عقیدہ پر رکھتے ہیں اور کسی عقیدہ سے آغاز کرنے کے بغیر کسی سائنس دان کا

چارۂ کار نہیں تو پھر کیا مسلمانوں کے لیے ہی یہ جرم ہے کہ وہ سائنس کی بنیاد کسی عقیدہ پر رکھیں۔ کیا اس کو جرم قرار دینے والے خود بھی اس جرم کے مرتکب نہیں؟ ع ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند!

سائنس کی صحیح اعتقادی بنیاد سائنس کی درستی اور ترقی کے لیے ناگزیر ہے

جب ہم مجبور ہیں کہ سائنسی تحقیق کی بنیاد کسی نہ کسی عقیدہ پر رکھیں' تو کیا ضروری نہیں کہ وہ عقیدہ درست ہو اور درست تصورِ حقیقت پر مبنی ہو' تاکہ ہمارے سائنسی نتائج غلط نہ ہوں۔ کیا مسلمان کا یہ تصور کہ ''خُدا ہی اس کائنات کی سچی حقیقت ہے'' تمام ممکن تصوراتِ حقیقت میں صرف ایک ہی تصورِ حقیقت نہیں جو صحیح اور سچا ہے۔ تو پھر اگر اشتراکی اور عیسائی سائنس دان اپنے اپنے باطل تصوراتِ حقیقت پر اپنی اپنی سائنس کی بنیاد رکھ سکتے ہیں اور یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ صرف ان ہی کی سائنس صحیح ہے تو مسلمان اپنے صحیح اور سچے تصورِ حقیقت پر سائنس کی بنیاد کیوں نہیں رکھ سکتا اور پھر اس کے بعد کیوں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ صرف اُسی کی سائنس صحیح ہے۔

سائنس اور فلسفہ کسی خُدا کو ثابت نہیں کرتے بلکہ بلا ثبوت کسی خُدا کو مان کر آگے چلتے ہیں

دوسرا مغالطہ اس میں یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ خُدا کو ثابت کر سکتے ہیں اور کسی وقت خُدا کو ثابت کر سکیں گے۔ اسی مغالطہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ سائنس کی بنیاد مشاہدات کے بے لاگ نتائج پر اور فلسفہ کی بنیاد غیر جانبدارانہ استدلال پر رکھی جاتی ہے۔ حالانکہ سائنس اور فلسفہ خود اپنے وجود کے لیے جھوٹے یا سچے خُدا یعنی حقیقتِ کائنات کے کسی غلط یا صحیح تصور کے محتاج ہیں۔ وہ کسی نہ کسی خُدا کو پہلے مان کر آگے چلتے ہیں لہٰذا وہ خُدا کو کیسے ثابت کر سکتے ہیں؟ اگر وہ کسی خُدا کو ثابت کر سکتے ہیں تو وہ وہی خُدا ہوتا ہے جس کو وہ پہلے مان لیتے ہیں' اور اگر وہ سچے خُدا کے تصور پر مبنی نہ ہوں تو سچے خُدا کو ثابت نہیں کر سکتے۔ اُوپر یہ عرض کیا گیا تھا کہ انسانی فطرت کے قوانین کی وجہ سے (جن کے سامنے ایک سائنس دان بھی سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے) سائنس ہمیشہ کسی تصورِ حقیقت کے ماتحت وجود آتی ہے۔ کوئی نہ کوئی تصورِ حقیقت انسان کا نصب العین ہوتا ہے جو اس کی پوری عملی زندگی پر حکمران ہوتا ہے۔ اور انسان کی عملی زندگی سے اس کی سائنسی سرگرمیاں الگ نہیں ہو سکتیں اور اس کے مشاہدات کے سائنسی نتائج بے لاگ نہیں ہوتے بلکہ اس کے نصب العین کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے فلسفی کی فلسفیانہ سرگرمیاں بھی اس کی عملی زندگی سے جدا نہیں کی جا سکتیں۔ فلسفی بھی کسی نہ کسی تصورِ حقیقت سے آغاز کرتا ہے جس کو وہ بلا ثبوت پہلے ہی مان چکا ہوتا ہے اور پھر اپنے استدلال کا سارا زور یہ ظاہر کرنے کے لیے صرف کرتا ہے کہ حقائقِ عالم اس تصورِ حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں تاکہ اس کا مخاطب بھی اس کی معقولیت کا احساس کر لے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ کسی تصورِ حقیقت کو غیر جانبدارانہ استدلال سے ثابت کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہوتی۔ وہ پہلے ہی بلا ثبوت کسی تصورِ حقیقت کا قائل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصورِ حقیقت حسن کا ایک تصور ہوتا ہے اور حسن کو محسوس کیا جا سکتا ہے' دیکھا جا سکتا ہے' لیکن ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

(باقی صفحہ 84 پر)

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: ڈاکٹر ابصار احمد

نام کتاب : مقالات وفتاویٰ

مصنّف ومؤلّف : ڈاکٹر صہیب حسن (صدر ''القرآن سوسائٹی' لندن'')

صفحات: 572 تاریخ اشاعت: (اغلباً) نومبر ۲۰۲۲ء ناشر : مکتبہ ضیاء السنۃ' اسلام آباد

فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر صہیب حسن صاحب سے قارئینِ حکمتِ قرآن خوب واقف ہوں گے کیونکہ برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور مجھ سے ان کا تعلق بہت پرانا (۱۹۶۱ء سے) ہے۔ وہ جماعت اسلامی کے بالکل ابتدائی اور اکابر زعماء میں شامل مولانا عبدالغفار حسنؒ کے صاحبزادے ہیں۔ جب مؤسس جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے حکمت عملی اور پالیسی کے حوالے سے ۱۹۵۷ء میں بنیادی اختلافات ہوئے تو مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا عبدالغفار حسن غفرلہما کے ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے بھی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی' اور اپنے طور پر دعوتِ دین اور تدریسِ قرآن وحدیث کے حلقے قائم کیے۔ ۱۹۶۲ء میں منٹگمری (حال ساہیوال) میں برادر مکرم نے کالج میں عصری تعلیم کے ساتھ عربی اور قرآن وسنّت کی تعلیم کے لیے ایک ہاسٹل ''دار المقامہ'' کا آغاز کیا جس میں راقم کالج کے سال دوم' ہمارے عم زاد مظفر بھائی کے علاوہ چار طلبہ سال اول کے رہائش پذیر ہوئے۔ ہمارے لیے عربی صرف ونحو اور دینی تربیت کے اتالیق کے طور پر لائل پور (حال فیصل آباد) سے جناب صہیب حسن کو بلایا گیا' جو فاضل عربی کا امتحان پاس کر چکے تھے اور بی اے کے انگریزی پرچوں کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ عمر میں مجھ سے دو اڑھائی سال بڑے ہیں۔ وقت کا سیل تیزی سے رواں ہے' چنانچہ گزشتہ دسمبر کے آخری ہفتے میں لاہور میں ملاقات ہوئی تو خاکسار نے اپنی عمر ۷۸ سال کے لگ بھگ اور ڈاکٹر صہیب حسن نے ۸۰ پلس بتائی' گویا وہ اسّی کی دہائی کے پہلے سال میں ہیں اور اس طرح ماشاء اللہ octogenarian ہیں۔ مَیں صحت و عافیت کے ساتھ ان کی عمر میں ازدیاد کے لیے دعا گو ہوں۔

دار المقامہ میں پانچ چھ ماہ پڑھانے کے بعد صہیب حسن صاحب کو مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی دعوت اور اصرار پر ان کی جگہ ان کے والد محترم مولانا عبدالغفار حسن صاحب نقل مکانی کر کے منٹگمری تشریف لائے اور ہمیں درسِ قرآن کے علاوہ عربی اور حدیث میں ''ریاض الصالحین'' کے منتخب ابواب پڑھائے۔ قیامِ ساہیوال کے دوران صہیب صاحب نے ڈاکٹر اسرار صاحب کو قریب سے دیکھا۔ سپول والے بڑے سائز

کے ٹیپ ریکارڈر پر قاری عبدالباسط کی تلاوتِ قرآن سے مسحور ہونا' اور اسی طرح ان کا زورِ خطابت' قرآن سے بے پایاں شغف' تاریخ اسلام پر گہری نظر' مغربی افکار پر نقد اور پاکستان کے سیاسی وثقافتی مسائل کے شعور نے انہیں بہت متأثر کیا' جس کا اظہار انہوں نے انتہائی فراخ دلی سے اپنی اس کتاب میں کیا ہے۔ صہیب حسن صاحب نے مدینہ منورہ میں چار سال تعلیم کے بعد جامعہ اسلامیہ سے ۱۹۶۷ء میں دینی علوم میں سند فراغت کے بعد نیروبی (کینیا) میں بطور مبعوث گیارہ سال دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتدریس میں صَرف کیے۔ بعدازاں سعودی حکومت کے مؤسّسہ دارالافتاء والارشاد کی جانب سے ان کی اپنی خواہش پر مستقلاً برطانیہ جانے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح صہیب صاحب نے جز وقتی طالب علم کی حیثیت سے پہلے ماسٹرز اور پھر برمنگھم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ بھی کر لی۔ زیرنظر کتاب میں شائع ہونے والے کچھ پرانے اور چند موجودہ شخصی خاکے اس بات کے گواہ ہیں کہ قسامِ ازلی نے آپ کو قلم کا شہسوار بنایا اور بے پناہ ذہانت وفطانت سے نوازا ہے۔

صہیب حسن صاحب محدود معنی میں ایک دینی عالم اور معلم ومدرس ہی نہیں' بلکہ عالمی سطح پر مسلم ممالک کے حالات اور سیاسی وثقافتی تبدیلیوں کا گہرا شعور بھی رکھتے ہیں۔ آپ متعدد دعوتی وتحقیقی کتب کے مؤلف ومصنف ہیں' جو آپ کے وسیع مطالعات' گہرے مشاہدے اور حساس طبیعت کی آئینہ دار ہیں۔ آپ کی تحریروں کو گہری نظر اور علمیت کے ساتھ ساتھ شگفتہ نثر نگاری کا وصف بھی حاصل ہے۔ چونکہ آپ نے دو طویل مضامین خاص طور پر ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے نظریہ خلافت اور سانحہ ارتحال پر لکھے ہیں' جن میں راقم کا ذکر بھی بار بار آیا' تو واقعہ یہ ہے کہ کتاب ہٰذا کے بہت سے صفحات پڑھتے ہوئے یادوں کا ایک ریلا اُمڈا چلا آیا اور مَیں تین ہفتے ان تحریروں کے سحر میں گرفتار رہا۔ یہ صرف ڈاکٹر صہیب حسن صاحب کی ذرہ نوازی اور کرم فرمائی ہے کہ انہوں نے میرا ذکر کیا۔ قرآن اکیڈمی میں میرے معاون محمد مشتاق ربّانی گواہ ہیں کہ ناچیز نے کتاب کے مقالات مشتمل بر ۴۷۰ صفحات بالاستیعاب مطالعہ کیے ہیں اور کچھ حصے تو ایک سے زیادہ بار نظر سے گزارے۔ البتہ تبصرے کے سلسلے میں اپنے عجزِ بیان کا کیا کروں کہ میری کیفیت مغلوب الحال اور ضیق المقال نوعیت کی ہے۔ صہیب صاحب کے طیبِ خاطر کے لیے کچھ مختصر سا لکھ رہا ہوں۔

''ڈاکٹر اسرار احمد کا تصوّرِ خلافت'' کے عنوان سے خاصا مفصّل ۳۰ صفحات کا مقالہ بہت عرق ریزی اور گہری علمی بصیرت سے لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے چونکہ اپنی فکر کو تین اصحاب (مولانا آزاد' علامہ اقبال اور مولانا مودودی) سے نسبت دی ہے اسی لیے صہیب صاحب نے مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے خیالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے حدیث ''خیر القرون'' کی مدّت کے تعین میں مختلف آراء پر بحث کی ہے۔ صہیب صاحب بانی حزب التحریر شیخ تقی الدین نبہانی کے استدلال برائے وجوبِ قیامِ نظامِ خلافت کے ناقد ہیں جس کی زد میں ڈاکٹر اسرار احمد بھی آجاتے ہیں۔ ان کے خیال میں اصل واجب تو دعوت الی اللہ اور شہادتِ حق علی الناس ہے۔ اگر ایمان وعمل صالح کی زندگی اختیار کی جائے' داعی الی اللہ کی نصرت کی جائے' اور اس تحریک میں جان ومال

کا نذرانہ پیش کیا جائے‘ مخالفینِ دعوتِ اسلام کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا وعدۂ استخلاف بھی پورا ہوتا ہے‘ جیسا کہ صحابہ کرام ؓ کے حق میں پورا ہوا تھا۔ یعنی مسلمان کا ہدف اللہ تعالیٰ کا عبدِ حقیقی بننا اور دین حق کی شہادت دینا ہو تو پھر خلافت بطور انعام حاصل ہوتی ہے۔ خلافتِ اسلامیہ پر مبنی نظامِ حکومت و سیاست کے خدوخال کے ضمن میں ڈاکٹر صہیب صاحب کے مطالعے میں آنے والی سب سے بہترین کتاب اردن یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد عبدالقادر ابوفارس کی بعنوان ’النظام السیاسی فی الاسلام‘ ہے۔ ان کے بیان کردہ تیرہ نکات کا موازنہ صہیب صاحب نے بانی تنظیم کی مبسوط کتاب ’’خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام‘‘ سے متعلق پیش کیے گئے افکار سے کیا‘ اور کئی جگہوں پر ان کی آراء کی نہ صرف تائید و تصویب کی بلکہ تحسین و ستائش بھی کی۔ مسلم ریاست میں فقہی اختلافات کا جو حل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پیش کرتے ہیں اس میں ترمیم کرتے ہوئے صہیب حسن صاحب کی تجویز یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل اور دیارِ غریب میں ’یورپین کونسل برائے فتویٰ و تحقیق‘ کا تجربہ بتاتا ہے کہ مختلف مسالک کے علماء بیٹھ کر باہمی مشاورت کی بنیاد پر اور مصلحت عامہ کی خاطر کسی ایک رائے پر اتفاق کر سکتے ہیں جو مفادِ عامہ اور عصر حاضر کی ضروریات سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس مبحث کا اختتام وہ جن الفاظ میں کرتے ہیں وہ ان کے قلبی احساسات اور نیک خواہشات کے آئینہ دار ہیں:

> ’’ڈاکٹر اسرار احمد وہ خوش بخت اور خوش قسمت شخص تھے جنہوں نے اپنی زندگی کو بامقصد گزارا۔ رجوع الی القرآن کی آواز کو ایک تحریک میں تبدیل کر دیا۔ نظامِ خلافت کے احیاء کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیّا کر دیا۔ جس مشن کو انہوں نے ساری عمر حرزِ جان بنا کر رکھا تھا‘ اسے آگے بڑھانے کے لیے نہ صرف اپنی صلبی اولاد بلکہ معنوی اولاد پر مشتمل ایک ایسی جماعت کو منظم کیا جو اسلامیانِ پاکستان کے لیے مشعل راہ اور مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔‘‘

کتاب ہٰذا میں بہت قیمتی معلومات سے مملو علم قرآنی اور فرقِ باطلہ وضالہ کی تاریخ اور نظریات پر مشتمل مضامین کو چھوڑ کر مَیں نے تبصرے کے لیے ڈاکٹر صہیب صاحب کی بائیوگرافیکل نگارشات کو زیادہ اہمیت دی ہے‘ جن سے ان کی دینی زندگی اور کدوکاوش کی روئیداد سامنے آتی ہے۔ آج سے بیس سال قبل مدینہ منورہ میں شاہ عبداللہ نے اپنے پیش رو شاہ فہد کے قرآن کمپلیکس کی طرح ’’حدیث کمپلیکس‘‘ کا منصوبہ تجویز کیا۔ چنانچہ اس کے لیے ایک عالمی سمپوزیم کا پروگرام بنایا گیا جس کا عنوان ’’سُنّت وسیرتِ نبویؐ سے متعلق سعودی عرب کی مساعی‘‘ رکھا گیا۔ تحقیقی مقالات کے لیے ایک سال قبل ہی بلادِ عرب و اسلام کے مختلف اساتذہ اور محققین حضرات سے پانچ بنیادی اور سینکڑوں ذیلی عنوانات کے حوالے سے رابطہ کیا گیا۔ یہ عالمی کانفرنس بالآخر ۴ تا ۶ مئی ۲۰۰۴ء منعقد ہوئی۔ منتظمین کی خواہش پر انگریزی زبان میں سُنّت کے بارے میں کتاب یا مقالہ کی شکل میں جو کچھ لکھا گیا‘ اسے ببلیوگرافی کی مدوّن صورت میں جمع کرنے کی سعادت ڈاکٹر صہیب صاحب نے حاصل کی۔ قبل ازیں جرمنی کے نومسلم احمد وان ڈنفر نے یورپین زبانوں میں سُنّت واحادیث کی کتابیات کا احاطہ ۱۹۸۰ء تک کا کیا تھا۔ صہیب حسن صاحب کے مقالے نے پچھلے کام پر پانچ سو کے لگ بھگ عناوین کا اضافہ

کر کے تمام مقالات میں صفحات کے اعتبار سے ضخیم ترین مقالہ پیش کیا۔ ان کی فہرست میں پہلی بار شیخ البانی کو بھی شامل کیا گیا۔ شیخ کی کتاب صفة الصلوٰة کا انگریزی ترجمہ بقلم ڈاکٹر اسامہ حسن ہے' جو صہیب صاحب کے بڑے صاحب زادے ہیں۔ فہرست میں خود صہیب صاحب کے اپنے ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مقالات کا تذکرہ بھی ہے۔ ان کی کوشش ہوگی کہ اس کے آئندہ ایڈیشن میں والد گرامی شیخ الحدیث مولانا عبدالغفار حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصنیف ''انتخابِ حدیث'' کے انگریزی ترجمہ کا ذکر بھی آجائے جو اسامہ حسن ہی نے کیا ہے اور اشاعت کے لیے تیار ہے۔ اس تفصیل کو صہیب صاحب نے تحدیثِ نعمت کے طور پر بیان کیا ہے کہ کس طرح ان کے خاندان کی پوری تین نسلوں کو اس علمی فہرست میں باستحقاق جگہ مل رہی ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۔ یہ پورا مضمون قیمتی معلومات سے لبریز ہے۔ راقم نے نمایاں پچاس مضامین میں سے ایک کو بالخصوص دلچسپ اور فکر انگیز پایا جس کا عنوان ہے: ''جدید تکنیک: سُنّت اور سیرت کی خدمت میں'' از قلم ابراہیم بن حماد الرسیس۔

ڈاکٹر صہیب حسن طویل عرصے سے امیر جمعیت اہلِ حدیث اور صدر مسجد و مدرسہ التوحید ٹرسٹ لندن (برطانیہ) ہیں۔ مسجد توحید لندن کے علاقے لیٹن (Leyton) میں واقع ہے۔ آغاز میں چھوٹے سے گھر میں واقع مسجد کس طرح علاقے کی مرکزی شاہراہ پر خوبصورت کشادہ جامع مسجد میں تبدیل ہوئی' کتاب کے صفحہ ۴۴۴ پر صہیب صاحب نے اس کی واقعاتی تفصیل کو یوں بیان کیا ہے:

> ''مسجد توحید کا آغاز لیٹن کے ایک دو منزلہ گھر کی عمارت سے ہوا تھا جس کی خرید کا سہرا شیخ ابن باز رحمہ اللہ کو جاتا ہے۔ میری درخواست پر انہوں نے بیس ہزار پاؤنڈ کا چیک ارسال کیا تھا جس میں چار ہزار کے اضافہ سے اپریل ۱۹۸۴ء میں متذکرہ عمارت خریدی گئی اور مسجد و مدرسہ توحید کا آغاز کیا گیا۔
>
> تیرہ سال اس چھوٹے سے مکان میں پنج وقتہ نماز' خطبہ جمعہ اور درس و تدریس کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر ہم اس علاقے کی مرکزی شاہراہ (ہائی اسٹریٹ) پر ایک بڑی عمارت خریدنے کے قابل ہوئے جسے گرا کر ایک نئی مسجد کی عمارت میں تبدیل کرنا مقصود تھا۔ ۹۴ء سے ۹۵ء اور پھر ایک سال کے تعطل کے بعد ۹۶ء سے ۹۷ء تک تعمیر جاری رہی اور دس لاکھ پاؤنڈ کے زرِ خطیر کے ساتھ وہاں ایک خوبصورت مسجد ظہور پذیر ہوگئی۔ اس مسجد کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا سنگ بنیاد ۲۸ جولائی ۱۹۹۴ء کو فضیلۃ الشیخ محمد بن عبداللہ السبیل نے رکھا۔ شیخ صالح بن حمید نے دورانِ تعمیر اپنی زیارت سے نوازا۔ شیخ عبدالرحمٰن السدیس نے ڈاکٹر عبداللہ المحسن الترکی کی معیت میں مسجد کی افتتاحی تقریب میں حصہ لیا اور پھر انہوں نے سال بہ سال کئی دفعہ اس مسجد میں نہ صرف نماز پڑھائی بلکہ خطاب بھی کیا۔ ایسے ہی شیخ سعود الشریم اور کئی دیگر سعودی مشائخ نے برطانیہ میں اپنی آمد کے موقع پر اس مسجد کو اپنے عالمانہ خطابات سے رونق بخشی۔''

ڈاکٹر صہیب حسن صاحب ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس مسجد میں دو بار صحیح مسلم کو مکمل پڑھانے کی سعادت حاصل کی۔ پہلی مرتبہ طویل دورانیہ کے ساتھ اور دوسری مرتبہ مختصر دورانیہ کے ساتھ۔ پہلی

کلاس کا آغاز ۱۹۹۵ء کے وسط سے کر کے تیرہ سال کی مدت میں ۲۸ جون ۲۰۰۸ء کو اختتام کیا۔ مختصر دورانیہ کا کورس ویک اینڈز پر رکھا گیا اور طلبہ نے بہت محنت اور دلچسپی کے ساتھ تین ہزار تینتیس احادیث کی قراءت کے ساتھ ان کا فہم حاصل کیا۔ بعد ازاں انہوں نے صحیح البخاری کی قراءت کا آغاز ماہِ محرم ۱۴۳۳ھ سے کر کے ربیع الثانی (مارچ ۲۰۱۲ء) میں اختتام کو پہنچایا۔ دونوں صحیحین کی تقسیم اسناد کی تقاریب ہوئیں جن میں لندن میں موجود علماء، زائرین اور فضلاء نے خطاب کیا۔ تقریب صحیح بخاری میں ایک مہمان مقرر شیخ عبدالرحمٰن الدمشقیہ (لبنان کے مشہور عالم، مؤلف اور محدّث، مقیم لندن) کی عالمانہ تقریر کا ایک جملہ راقم نے بہت اہم اور حقیقت کا عکاس پایا: ''ہم تاریخ کے اوراق میں ان اتقیاء وصلحاء کا تذکرہ پڑھتے ہیں جو دنیا میں زہد اختیار کرتے تھے، لیکن اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ علم میں زہد اختیار کیے ہوئے ہیں۔'' انگلستان بالعموم اور اس کے چند شہر بشمول لندن بالخصوص دنیا بھر کے تارکین وطن کا مسکن ہیں، چنانچہ دورۂ حدیث کی کلاسوں میں طلبہ قومیت کے اعتبار سے پاکستانی، بنگلہ دیشی، مصری، صومالی، مراکشی و الجزائری، کینیا اور تیونس کے تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صہیب حسن صاحب کو کاسموپولیٹن استاذ اور عالم دین ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

نیروبی (کینیا) میں قیام کے دوران صہیب صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا عربی میں ترجمہ کیا، جو بالاقساط ندوۃ العلماء لکھنؤ کے عربی جریدۃ ''البعث الاسلامی'' میں شائع ہوا۔ اس کاوش میں بقول ان کے وہ جذبہ کام کر گیا جو اسرار صاحب کی تقریر وتحریر کی ساحرانہ تاثیر کا مرہونِ منت تھا۔ صہیب صاحب نے بجا طور پر اس بات پر فخر کا اظہار کیا ہے کہ اس عربی کتابچے نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو عرب قارئین میں روشناس کرانے میں مدد دی۔

سنن ترمذی میں وارد حدیث ((تعلّموا من انسابکم ما تصلون به ارحامکم .....)) پر عمل کرتے ہوئے ڈاکٹر صہیب صاحب نے اپنی پوری عمر پرکھوں کو خوب یاد رکھا اور ''عمر پوری'' خاندان کی علمی و دینی خدمات کو اُجاگر کیا۔ آپ کے پردادا مولانا عبدالجبار عمر پوری (پیدائش ۱۲۷۷ھ، وفات ۱۳۴۴ھ)، دادا مولانا حافظ عبدالستار حسن اور والد مولانا عبدالغفار حسن (وفات مارچ ۲۰۰۷ء) ﷺ سبھی نے مشہور مدارس میں قرآن وحدیث اور دوسرے مروجہ دینی علوم کی تحصیل کی۔ مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کی اسنادِ حدیث میں سب سے پہلے ان کے استاد اور مربی مولانا احمد اللہؒ (ف: مارچ ۱۳۶۲ھ) آتے ہیں، جنہوں نے سید نذیر حسین دہلویؒ سے درسِ حدیث لیا۔ مولانا عبدالغفار حسنؒ نے دہلی کے مشہور مدرسہ رحمانیہ میں قابل اساتذہ کے علاوہ مشاہیر علماء سے بھی استفادہ کیا جن میں صاحب مرعاۃ المفاتیح، مولانا عبیداللہ مبارک پوری، نامور ادیب مولانا محمد سرسوتی، صاحب تحفۃ الاحوذی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری شامل ہیں۔ دورانِ تعلیم کئی زائر علماء سے بھی فیض یاب ہوئے جن میں مولانا داؤد غزنوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابراہیم سیالکوٹی اور ترکستانی عالم موسیٰ جار اللہ ﷺ نمایاں ہیں۔ خود صہیب صاحب نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم کے دوران کئی

اصحابِ علم وفضل سے کسبِ فیض کیا جن میں وہ خاص طور پر شیخ محمد الامین الشنقیطی کا نام لیتے ہیں جو تفسیر اور اصولِ فقہ میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔

اس کتاب سے محترم صہیب صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو پہلی بار میرے علم میں آیا ہے کہ وہ شعر وسخن میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور اچھے بھلے شاعر ہیں۔ ہماری دینی تہذیب وروایت میں صاحبانِ علم وعرفان عام طور پر لفظ اور لغت کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے کے حوالے سے شعر اور زبان کی تخلیقی صلاحیتوں سے بہرہ ور بھی ہوتے رہے ہیں۔ برمنگھم میں مولانا حبیب اللہ امیر الدین اثری کے ''منظوم ترجمانِ قرآن'' کی تقریب رونمائی (مئی ۲۰۱۶ء) میں اپنے مقالے میں قرآن کے گیارہ منظوم ترجموں کی فہرست سامعین کے سامنے رکھی' بہت عمدہ اور مفید ناقدانہ تبصرہ کیا اور آخر میں اپنا ہدیہ تہنیت نظم کی شکل میں پیش کیا۔ مطلع کے دو اشعار یہ ہیں:

میرا کمالِ ذات' نہ تیرا کمالِ ذات — پیدا کیا ہے جس نے' ہے اُس کے کرم کی بات
ظاہر ہوئے نبیوں کے ہاتھوں سے معجزات — ولیوں سے بھی ہوئے ہیں کرامت کے واقعات

اور دو اشعار مقطع کے ملاحظہ فرمائیے:

رب کی رضا کے واسطے ہوں گنگنا رہا — شاید کرے قبول یہ دعواتِ صالحات
ناچیز ہوں مَیں بندہ حسنؔ خواستگار ہوں — یارب حسن بنا دے تو ہر ایک میری بات!

مسجد توحید لندن میں ڈاکٹر صہیب حسن صاحب کے چودہ سالہ فرزند ارجمند مجاہد حسن کے تکمیلِ حفظِ قرآن کی تقریب ایک مختصر تحریر میں بیان کی گئی ہے۔ اس پر تاریخ یا سن نہیں دیا گیا اس لیے نامعلوم کتاب کی طباعت کے وقت عزیز مجاہد حسن کتنی عمر کے ہوں گے۔ امید ہے وہ بیس بائیس سال کے جوانِ رعنا اور والدین کی تربیت وتادیب کے زیرِاثر نہ صرف خود توحید وسُنّتِ رسول ﷺ کو اپنائے ہوئے ہوں گے' بلکہ جدید علمی وتہذیبی مسائل کا فہم حاصل کر کے انہیں دینِ متین کی روشنی میں جدید تعلیم یافتہ اذہان تک پہنچانے کی صلاحیت بھی حاصل کر رہے ہوں گے۔

راقم یوٹیوب پر موجود مغربی اکیڈیمیا میں ہونے والے آن لائن اور podcast پروگراموں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ اب قرآن وسُنّت کے علمی وعارفانہ حقائق پر گفتگو اور بحث یونیورسٹیوں اور مختلف اداروں میں بہت سنجیدگی کے ساتھ ہو رہی ہے اور اسلام دیارِ غرب (امریکہ اور یورپ) کے اکیڈیمک ڈسکورس کا حصّہ بن چکا ہے۔ یہ صورتِ حال اُس وقت قطعاً نہیں تھی جب اوائل ۱۹۷۰ء میں راقم الحروف نے انگلستان سے پاکستان مراجعت کی۔ بہرحال اُمّت کے ذہین اور تعلیم یافتہ افراد کو شہادتِ حق کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دیں اور حالات کو بھی اس فرض کی ادائیگی کے لیے سازگار بنائیں۔ آمین!

(۲)

نام کتاب : مطالعہ نزولِ قرآنِ مجید (حیاتِ طیبہ کے تناظر میں قرآن فہمی)

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر تسنیم احمد

ضخامت: ۲۳۲ صفحات ہدیہ فنڈ برائے اشاعت مزید: ۳۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: اسلامک پبلی کیشنز، ملتان روڈ، لاہور

پروفیسر ڈاکٹر تسنیم احمد نے سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد ۱۳ جلدوں میں چار ہزار صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ''روح الامین کی معیت میں کاروانِ نبوت'' تصنیف کی۔ یہ کتاب سیرتِ طیّبہ پر لکھی گئی ہزاروں کتابوں میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب میں قرآنی آیات کی تنزیل کے پس منظر میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہونے والے واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے جس سے نہ صرف سیرتِ طیبہ کے حالات کی تفصیل ملتی ہے بلکہ قرآن کریم کی آیات کی نزولی ترتیب سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

جب اس ضخیم کتاب کی تلخیص کی ضرورت محسوس کی گئی تو زیر تبصرہ کتاب آسان اور مختصر انداز میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں واقعات کی تفصیل نہیں دی گئی، البتہ جہاں ضرورت محسوس کی گئی وہاں مفصّل کتاب کی جلد کا نمبر اور صفحہ درج کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو تشنگی محسوس نہ ہو۔

اس کتاب میں قرآنی آیات کے تناظر میں قرآن فہمی کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح سیرت کی یہ کتاب دیگر کتب سیرت میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی فضیلت اس اعتبار سے نمایاں ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اسلامیات ان کا سبجیکٹ نہ رہا، بلکہ وہ تو زندگی بھر علوم الادویہ (Pharmaceutical Science) کے تحصیل و تدریس میں مصروف رہے۔ ان پر کسی فقہی مسلک کی چھاپ بھی نہ لگی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآنی آیات پر غور و فکر اور تدبّر کر کے سیرت طیبہ کو مخصوص انداز میں ترتیب دیا۔ یوں تحقیقی مزاج رکھنے والے اہلِ علم کے لیے کارآمد سرمایہ فراہم کیا۔ کتاب کی ہر سطر سے رسول امین ﷺ کے ساتھ ان کی محبت ظاہر ہے۔ مصنف کے بقول، اس کتاب کے لکھنے سے نہ پیسہ کمانا مقصود ہے اور نہ شہرت۔ مطلوب ہے تو صرف رضائے الٰہی۔ کتاب کا سرورق سادگی کا نمونہ ہے۔ کاغذ سفید اور معیاری ہے۔ مضبوط جلد کے ساتھ یہ کتاب دیدہ زیب ہے۔

(تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

❁❁❁

Verse 151

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

[Moses] said, "My Lord, forgive me and my brother and admit us into Your mercy, for You are the most merciful of the merciful."

Prophet Moses *(AS)* beseeched Allah's *(SWT)* forgiveness for himself and his brother Prophet Haroon *(AS)*, not because they had committed any sin, but as a sign of sheer humility and submission before Allah *(SWT)*, and also to express his hatred regarding the hideous actions of the idol-worshippers. It is also a lesson for us to learn and contemplate that we must always seek Allah's *(SWT)* forgiveness out of humility and as a sign of total submission and surrender to the Lord *(SWT)* of the Worlds.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

بقیہ: اسلام اور سائنس

نہ اپنے لیے اور نہ دوسروں کے لیے۔ پہلے سے طے کیے ہوئے اعتقاد کے بغیر سائنس اور فلسفہ دونوں ممکن نہیں ہوتے۔ اقبال نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنّا جسے کہہ نہ سکیں رُوبرو

علم و فن از بیش خیزانِ حیات
علم و فن از خانہ زادانِ حیات

زندگی سرمایہ دار از آرزوست
عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست

اعتقاد کی حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی تصوّر کے اوصاف حسن اور صداقت اور خیر کا ایک احساس ہوتا ہے اور ان اوصاف کی آرزو اس میں شامل ہوتی ہے۔ اقبال اعتقاد ہی کو کبھی عشق اور کبھی آرزو اور کبھی تمنّا کہتا ہے اور اسے سرمایۂ زندگی یا سرمایۂ حیات قرار دیتا ہے۔ آرزو زندگی یا حیات کا خاصہ ہے۔ (جاری ہے)

84) The implication being that even with the best of intentions, hastening was not the appropriate choice.

Already filled with rage and grief, Prophet Moses *(AS)*, as it appears, addressed his assistant and the vicegerent appointed during his absence, Prophet Haroon *(AS)*, expressing his displeasure. Prophet Moses *(AS)* said to Prophet Haroon *(AS)* that he had entrusted him with the community's affairs in his absence. How come the Children of Israel exceeded the Lord's *(SWT)* command and did not wait for his return? In his anger and grief, Prophet Moses *(AS)* cast the stone tablets to the ground and seized his brother, Prophet Haroon *(AS)*, pulling him by the hair. In response, Prophet Haroon *(AS)*, while addressing Prophet Moses *(AS)* as the son of his mother said that the community had overpowered him and they wanted to kill him. He *(AS)* was so helpless that despite his best efforts, he could not stop them from the transgression. He *(AS)* pleaded with Prophet Moses *(AS)* not to allow the enemies of Allah *(SWT)* to use this interaction as a means to belittle him and gloat. For surely, Prophet Haroon *(AS)* was not from among the wrongdoers.

Strange though it may appear, the Israelites maligned the characters of those very people whom they believed to be the Messengers *(AS)* of Allah *(SWT)* back then and they continue to do it even today. The 'Torah' in its current corrupted form is full of accusations they hurled at the Prophets *(AS)* and Messengers *(AS)* including such heinous allegations as polytheism, sorcery, fornication, deceit, and treachery. Needless to say, indulgence in any of these sins is disgraceful for even an ordinary believer and decent human being, let alone Prophets *(AS)*. In the light of the history of Israeli morals, however, it is quite understandable why they maligned their Prophets *(AS)*. In times of religious and moral degeneration when both the clergy and laity were steeped in sin and immorality, they tried to seek justification for their misdeeds. To sedate their consciences, they ascribed the very sins of which they were guilty to their Prophets *(AS)* and then their own inability to refrain from sins because not even the Prophets *(AS)* could refrain. The Qur'an, however, flatly refutes their twisted account in many places and points out that it was Sāmiri the rebel of Allah *(SWT)* rather than Prophet Haroon *(AS)* who committed that heinous sin. *(Ref: Surah TaHa 20: 85 and 90)*

Verse 149

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

And when regret overcame them and they saw that they had gone astray, they said, "If our Lord does not have mercy upon us and forgive us, we will surely be among the losers."

Those of them who had a profound realization of the magnitude of their error and grasped that they had deviated from the right path, repented to their Lord *(SWT)*, seeking His mercy and forgiveness. It clearly dawned on them that without the mercy and forgiveness of Allah *(SWT)* they would surely be counted among the ultimate losers.

Verse150

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۡ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

And when Moses returned to his people, angry and grieved, he said, "How wretched is that by which you have replaced me after [my departure]. Were you impatient over the matter of your Lord?" And he threw down the tablets and seized his brother by [the hair of] his head, pulling him toward him. [Haroon] said, "O son of my mother, indeed the people oppressed me and were about to kill me, so let not the enemies rejoice over me and do not place me among the wrongdoing people."

When Prophet Moses *(AS)* returned to his people from Mount Toor, he was in a state of profound anger and sorrow, due to their wretched transgression. Prophet Moses *(AS)* had been informed by Allah *(SWT)* that his nation had gone astray, while he was on Mount Toor. This has been alluded to in Surah Ta Ha that, when Prophet Moses *(AS)* arrived ahead of the appointed time due to his overwhelming love for Allah *(SWT)*, he was asked why he had left his nation earlier than the appointed time. Prophet Moses *(AS)* replied, 'They are close upon my tracks, and I hastened to You, my Lord, that You be pleased.'Allah responded 'But indeed, We have tried your people after you [departed], and the Sāmiri has led them astray.' *(Ref: Surah Ta Ha, 20: 83-*

success in the Hereafter rather than merely in this world. *Iman Bil Akhirah* (faith in the Hereafter), is pivotal in directing a person towards the true belief in Allah *(SWT)* and His Prophets *(AS)*, as it creates that sense of accountability and answerability to Allah *(SWT)* on the Day of Judgement. It makes a person think twice before every utterance and action. If these conditions are not fulfilled, a person's acts will be of no consequence. He who performs an act in defiance of Allah's *(SWT)* guidance, is guilty of rebellion and is undeserving of Allah's *(SWT)* reward. He who acts only to obtain worldly success is neither entitled to nor should expect any reward from Allah *(SWT)* in the Hereafter.

Verse 148

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝

And the people of Moses made, after [his departure], from their ornaments a calf – an image having a lowing sound. Did they not see that it could neither speak to them nor guide them to a way? They took it [for worship], and they were wrongdoers.

Here reference is made to the forty days which Prophet Moses *(AS)* spent on Mount Sinai in compliance with Allah's *(SWT)* command when his people remained in the plain at the foot of a mountain. The Children of Israel, after Prophet Moses *(AS)* had left for Mount Toor, started worshipping a cow (calf), which was cast out of some golden ornaments by a person called 'Sāmiri'.*(Ref: Surah Ta Ha, 20: 85)* The verse implies that the calf was only a lifeless body with the mooing sound of a cow. Their cow-worship was another manifestation of the Israelites' slavish attachment to Egyptian traditions at the time of the Exodus. It is well-known that cow-worship was widespread in Egypt and it was during their stay there that the Israelites developed this strange infatuation. The Qur'an also refers to their inclination to cow-worship: 'Their hearts were overflowing with love for the calf because of their unbelief' *(Ref: Surah Al-Baqarah, 2: 93)*. The verse also states that a true deity should recognize the right and wrong, be able to provide clear instructions and be able to guide the worshippers to salvation. Those who took the false deity besides Allah *(SWT)* were the transgressors.

It is Allah's *(SWT)* law that evil-doers do not and cannot take any lesson from the otherwise instructive events that they observe. The arrogance mentioned here refers to man's delusion that he is on a higher plane than Allah's *(SWT)* creatures and servants. It is this which prompts him to disregard Allah's *(SWT)* command and to adopt an attitude which suggests that he neither considers himself Allah's *(SWT)* servant, nor Allah *(SWT)* his Lord *(SWT)*. Such delusion may also take the form of outright disbelief in Allah *(SWT)*, despite clear signs to the contrary. Such egotism has no basis in fact; it is sheer vanity. For as long as man lives on Allah's *(SWT)* earth, what can justify his living as a servant of anyone other than the Lord *(SWT)* of the universe? It is for this reason that the Qur'an declares this arrogance to be 'without any right'. That is because even if they see all the signs, their demands of miracles are granted, but still they do not believe in Allah *(SWT)* and His Prophets *(AS)*. Even when the path to success and righteousness is shown to them clearly and they see it, they do not follow it, because they have no intention of doing so. The importance of intention is elucidated by the famous hadith, which has been placed at the beginning of the collections of most *Muhadiseen* (scholars and writers of the books of Hadith), as narrated by Umar bin Khattab *(RA)*, "I heard the Messenger of Allah *(SAAW)* say: "Actions are (judged) by intentions (*niyyah*), so each man will have what he intended." *[Ref: Al-Bukhari & Muslim]* The Qur'an itself states in verse 26 of Surah Al-Baqarah that those who are transgressors and arrogant get misguidance from the Qur'an and that happens because their intentions are not pure.

Verse 147

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۧ

Those who denied Our signs and the meeting of the Hereafter, their deeds have become worthless. Are they recompensed except for what they used to do?

That the acts of such persons are vain and fruitless is evident from the fact that the acceptance of man's acts by Allah *(SWT)* is subject to two conditions. First, one's acts should conform to the Law laid down by Allah *(SWT)*. Second, man should be prompted by the desire to achieve

Verse 145

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

And We wrote for him on the tablets [something] of all things – instruction, and explanation for all things, [saying], "Take them with determination and order your people to take the best of it. I will show you the home of the defiantly disobedient."

The stone tablets bestowed on Prophet Moses *(AS)* contained details of all things necessary for guidance. They contained admonition and exhortation for doing good and avoiding evil, details of everything essential for the guidance of man in this world for success in the Hereafter. The Israelites were asked to hold fast to the Law and to follow it in its plain meaning, a meaning which can be grasped by an ordinary man of sound heart and good intent with the help of his common sense. This stipulation was added to discourage the chicanery and hair-splitting to which 'lawyers' resort to accommodate the crooked aims of the people. The warning was necessary to emphasize that holding fast to the Law was not to be equated with following the chicanery of the 'lawyers'.The Israelites were also told that on their way they would come across the ruins of earlier nations who had refused to turn to Allah *(SWT)* and who had persisted in their evil ways. Observing those ruins would be instructive in so far as they eloquently spoke of the tragic end that meets those who indulge in such iniquity.

Verse 146

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝

I will turn away from My signs those who are arrogant upon the earth without right; and if they should see every sign, they will not believe in it. And if they see the way of consciousness, they will not adopt it as a way; but if they see the way of error, they will adopt it as a way. That is because they have denied Our signs and they were heedless of them.

repenting and seeking His forgiveness. Prophet Moses *(AS)* declared that he was the first to believe in Allah's *(SWT)* declaration that he could not see Him, and he wholeheartedly embraced this truth.

Verse 144

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝

[Allah] said, "O Moses, I have chosen you over the people with My messages and My words [to you]. So take what I have given you and be among the grateful."

Allah *(SWT)* said to Prophet Moses *(AS)* that He *(SWT)* had elevated him above all of mankind and chosen him through His messages and the conversation with his Lord *(SWT)*. It's essential to note that this personal discourse with Allah *(SWT)* on earth was exclusive to Prophet Moses *(AS)*. However, in the grand scheme of things the Prophet Muhammad *(SAAW)* holds complete superiority over all other Prophets and Messengers *(AS)*, although certain attributes or aspects may have been granted to other messengers. For instance, the most prominent and conspicuous of visible miracles were bestowed upon Prophet Jesus *(AS)*, as mentioned in Surah Al-Maida. In the same way, as mentioned in Surah An-Nisa, Allah *(SWT)* engaged in a direct conversation with Prophet Moses *(AS)*, not mere inspiration. Allah *(SWT)* instructed Prophet Moses *(AS)* to hold firmly to the guidance granted to him and to be among the grateful. In this case, the reference is to the divine bestowal of the Torah, which Prophet Moses *(AS)* received during his appointment with his Lord *(SWT)* on Mount Toor.

Another important point to be noted is that although the Prophets *(AS)* and Messengers *(AS)* of Allah *(SWT)* are innocent from the time of their birth. Yet, to receive the Word of Allah *(SWT)*, they had to undergo very strict, spiritual exercises to withstand the weight of the revelation of the Word of Allah *(SWT)*. That forty-day spiritual exercise was necessary for Prophet Moses *(AS)* to be able to receive Torah from Allah *(SWT)*. We know that Prophet Muhammad *(SAAW)* used to go to the Cave of Hira to meditate there for days and nights, before the first revelation of the Qur'an was bestowed on him *(SAAW)*.

Prophet Haroon *(AS)* was placed under the direction of the Prophet Moses *(AS)* and was required to assist him in connection with his mission. As explained elsewhere in the Qur'an, Haroon *(AS)* was not assigned independent prophethood; he *(AS)* was rather appointed a Prophet by Allah *(SWT)* in response to Moses'*(AS)* prayer that he be appointed as his assistant. *(Ref: Surah Ta Ha 20: 29-31)*

Verse 143

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ
فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ
سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

And when Moses arrived at Our appointed time and his Lord spoke to him, he said, "My Lord, show me [Yourself] that I may look at You." [Allah] said, "You will not see Me, but look at the mountain; if it should remain in place, then you will see Me." But when his Lord appeared to the mountain, He rendered it level, and Moses fell unconscious. And when he awoke, he said, "Exalted are You! I have repented to You, and I am the first of the believers."

Moreover, Prophet Moses *(AS)* emphasized to Prophet Haroon *(AS)* the need for reform among his people. An intriguing incident took place when Moses *(AS)* arrived at the appointed time (and place), as designated by the divine decree, to have a conversation with his Lord *(SWT)*. At this juncture, a deep desire welled up within Prophet Moses's *(AS)* heart, and he made a humble request to his Lord *(SWT)* to reveal Himself to him, so that he may behold Him. However, Allah *(SWT)* responded by declaring that Prophet Moses *(AS)* would not be able to see Him. Allah *(SWT)* told Prophet Moses *(AS)* to fix his gaze upon that mountain and He *(SWT)* shall cast one of His *Tajallees* (divine manifestations) upon it, and if the mountain can withstand it, then Moses *(AS)* may have hope of seeing Him *(SWT)*. Then, in a moment of divine radiance, Allah's *(SWT)* *Tajallee* shone upon the mountain. The mountain crumbled to dust not being able to withstand the *Tajallee*, and Moses *(AS)* lost consciousness. When he*(AS)* regained his senses, he humbly proclaimed the Glory of Allah *(SWT)*, his Lord *(SWT)*,

Exposition of verses 142 – 151 of Surah Al-A'raf

Verse 142

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

And We made an appointment with Moses for thirty nights and perfected them by [the addition of] ten; so the term of his Lord was completed as forty nights. And Moses said to his brother Haroon, "Take my place among my people, do right [by them], and do not follow the way of the corrupters."

After the exodus of the Israelites from Egypt which marked, on the one hand, the end of the constraints of slavery and on the other, the beginning of their life as an independent nation, Prophet Moses *(AS)* was summoned by Allah *(SWT)* to Mount Toor (Sinai) so that he might receive the Law for Bani Israel. He *(AS)* was initially summoned for a period of thirty nights, with ten nights added to make it forty days and nights, so that he might single-mindedly devote himself to worshipping, fasting, meditation, and reflection and thus develop the ability to receive the revelation which was to put a very heavy burden upon him.

From this narrative, we can draw parallels to the concept of 'Chillah' (forty days and nights), a practice observed by mystics and followers of the Tablighi Jamaat. It involves a forty-day period of devotion, during which one disconnects from their family and business, focusing solely on Salah, Dhikr, and the dissemination of Allah's *(SWT)* message. While the specifics may vary among different groups, the underlying methodology is fundamentally sound. Leaving one's immediate surroundings to immerse in a pious environment can lead to the best performance of acts of faith and devotion. This experience can be transformative, redirecting one's life's course.

Prophet Moses *(AS)* advised his elder brother, Prophet Haroon *(AS)*, before his departure to Mount Toor. He entrusted Haroon *(AS)* with the role of vicegerent among their people, urging him to maintain order and refrain from following the paths of troublemakers and transgressors. This counsel exemplifies the importance of leadership and the rejection of mischievous influences.

Verses 138 through 141 detail the journey (exodus) of the Bani Israel led by the Prophets Moses *(AS)* and Haroon *(AS)* towards the Holy Land of Palestine. Emerging from their long period of subjugation in Egypt, the Bani Israel found themselves influenced by the culture and practices of the Egyptians, including idol worship. This inclination to indulge in idolatry demonstrated the extent to which the Israelites had been affected by their prolonged servitude. The Qur'anic term "ya'kufun" is used in the context of meditation before idols, which the Israelites asked to be provided. Those who take deities besides Allah *(SWT)* are destined for destruction, and their polytheistic beliefs lack a foundation in truth. Prophet Moses *(AS)* reproached the Children of Israel for their inclination toward transgression, emphasizing that he *(AS)* could never endorse the worship of any deity other than Allah *(SWT)*. This was a blatant deviation from the righteous path.

Moses *(AS)* had been chosen by Allah *(SWT)* as a Prophet to guide the Bani Israel toward the truth, elevating them as Allah's *(SWT)* vicegerents and granting them a position of honour among the nations. Moses *(AS)* reminded his people of how Allah *(SWT)* had saved them from the oppression of Pharaoh, who subjected them to severe punishment by killing their male offspring while sparing the female ones. This was a deliberate attempt to subjugate them and keep them in perpetual servitude to satisfy their malevolent desires. It was indeed a significant trial from Allah *(SWT)*. In summary, the journey of the Bani Israel, led by Moses *(AS)* and Haroon *(AS)*, towards the Holy Land of Palestine was marked by significant events, including their encounter with idol-worshipping nations, their inclination towards idolatry due to their Egyptian influences, and Prophet Moses' *(AS)* firm reprimand of this deviation. Verses 138 – 141 underscore the importance of monotheism and serve as a reminder of the catastrophic consequences of polytheism and transgression. Prophet Moses *(AS)* emphasized their role as Allah's *(SWT)* vicegerents and recounted the divine intervention that had saved them from the clutches of Pharaoh's oppression.

==========

failing to fulfill this promise led to the tragedy of 1971 when Pakistan was split into two. This was a punishment from Allah *(SWT)* for breaking their promise. Pharaoh's people experienced a severe drought and famine, which were the signs from Allah *(SWT)* to lead them back to the right path. Despite these signs, they remained stubborn and arrogant, attributing their troubles to Moses *(AS)* and his followers. The verses emphasize that both blessings and calamities are from Allah *(SWT)* and serve as reminders. Divine afflictions often aim to awaken people from their misguided ways. Pharaoh's courtiers and his nation persistently labeled Moses'*(AS)* miracles as sorcery, even though they knew the signs were granted by Allah *(SWT)*. They were divinely punished with a decline in agricultural output, drought, and further afflictions, including floods, locusts, lice, frogs, and blood. These were clear signs from Allah *(SWT)*, calling the disbelievers to submit and heed to Moses' *(AS)* message. Whenever struck by plagues, Pharaoh's people would beg Moses *(AS)* to intercede with Allah *(SWT)* for relief, promising to release the Israelites. However, after the affliction was removed, they broke their covenant and returned to their old ways. This pattern was repeated multiple times. Allah *(SWT)* gave them chances to seek redemption, but they continued to transgress, ultimately facing complete retribution.

Moses *(AS)* eventually led the Israelites out of Egypt, and Pharaoh's forces pursued them into the sea. Pharaoh and his entire army were drowned, while Allah *(SWT)* saved Moses *(AS)* and his people. Those who rejected Allah *(SWT)* and Moses *(AS)*, due to their iniquity, arrogance, and disbelief, met a tragic end. After enduring oppression in Egypt for many years, the Israelites finally witnessed the fulfillment of Allah's *(SWT)* promise. They later became the inheritors of Palestine, with their eventual entry into the Holy Land. In summary, verses 127 through 137 detail Prophet Moses' *(AS)* struggle against Pharaoh and his people, emphasizing the consequences of arrogance, oppression, and disbelief. The verses also highlight the ultimate triumph of faith and patience, as well as the fulfillment of divine promises.

Recap of verses 127 – 141 (inclusive) of Surah 7, Al-A'raf

Verses 127 through 137 continue with the discourse related to an important chapter in the history of Bani Israel and the enormous battle of Prophet Moses *(AS)*, along with his brother Haroon *(AS)* and the believers against Pharoah. Verses 127 through 137 detail the struggle that unfolded in Egypt between Pharoah, his advisers, the magicians, and sorcerers summoned by Pharaoh and Moses *(AS)* and his followers. Moses *(AS)*, the Messenger of Allah *(SWT)*, confronted Pharaoh and his people with the truth, challenging their beliefs and practices. The narrative begins with the background of Moses *(AS)*, who was saved from certain death as an infant when his mother placed him in a box in the Nile River. He *(AS)* was discovered by Pharaoh's wife, who later became a believer, and raised him as an adopted son in the palace. Two phases of persecution were inflicted upon the Israelites in Egypt. The first occurred before Moses' *(AS)* birth when Pharaoh ordered the killing of Israelite male infants. The second phase began after Moses *(AS)* received Prophethood. This persecution aimed to erase the identity of the Israelites and forcibly assimilate them. Moses *(AS)* reassured his people, urging them to have patience and trust in Allah *(SWT)*. He *(AS)* emphasized that the earth and its dominion belonged to Allah *(SWT)* alone, and He *(SWT)* would grant authority to whomever He *(SWT)* willed. Pharaoh and his people were allowed a reprieve but only as long as Allah *(SWT)* decreed. Victory would ultimately belong to those with true faith and Taqwa, and they would also succeed in the Hereafter. The Israelites recounted the ongoing persecution they endured, both before and after Moses' *(AS)*arrival. The torment included the killing of male offspring and other hardships. Moses *(AS)* advised his people to maintain their faith in Allah *(SWT)*, promising that Allah *(SWT)* would destroy their enemies as He *(SWT)* wills, and make Israelites His *(SWT)* vicegerents on earth.

This narrative draws a parallel to the history of the Indian subcontinent, particularly Pakistan's creation. Muslims prayed for deliverance from colonial British rule and the Hindu majority. They pledged to establish Islam in their independent nation. However,

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr.Israr Ahmad

SurahAl-A'raf

(The Heights)

(Recap of verses 127 – 141of Surah,7, Al-A'raf, and exposition of Verses142 – 151 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Verse) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQur'an.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.